ایک عجیب و غریب شخص کے کارنامے

حکیم بدّھن

بہزاد لکھنوی

مرتبین

شکیل عادل زادہ
سید حسن نواب

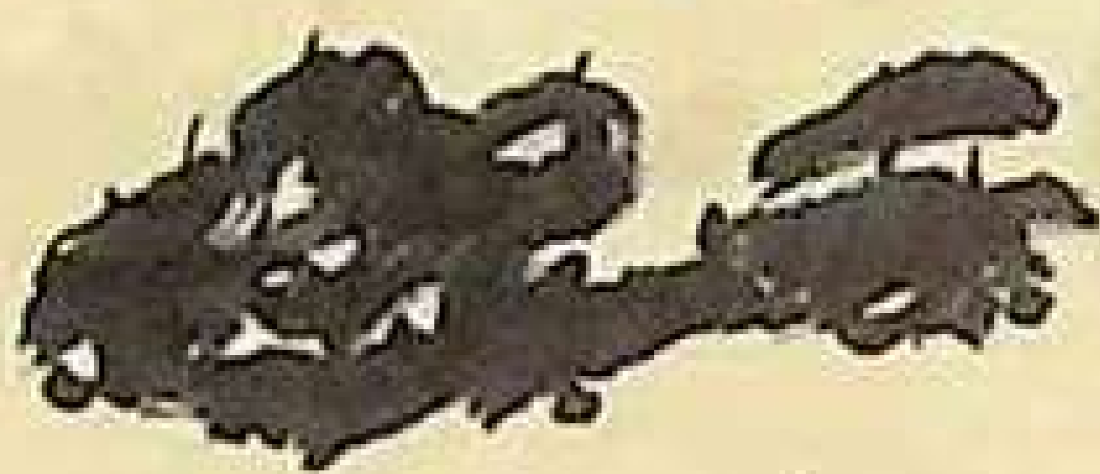
غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی

ٹائیٹل — دلاور مرزا

بار اول — ایک ہزار

طباعت — انجمن پریس کراچی

سنہ اشاعت — جولائی ۶۸ء

 [redacted] —  [redacted]

سول ایجنٹ

کراچی نیوز پیپر ایجنسی ۶۱۔ فریئر مارکیٹ کراچی

ناشر

غضنفر اکیڈمی پاکستان

جے۔ بی ۲۶ جیل روڈ کراچی

رئیس امروہوی

نقشِ بہزاد

حضرت بہزاد لکھنوی منفرد اندازِ بیان رکھنے والے شاعر ہیں۔ یہ بات مجھے اس وقت سے معلوم تھی جب میرے ذوقِ سخن نے ہوش سنبھالا تھا۔ نثر کے میدان میں بھی ان کا اشہبِ قلم ایسی جولانیاں اور ترکتازیاں دکھا سکتا ہے اور وہ حکیم بڈھن جیسے عجیب الخلقت کرداروں کو زندہ آدمی کے روپ میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بات حال میں معلوم ہوئی۔ عالمی ڈائجسٹ میں حکیم بڈھن کی مہمات پر ایک دلچسپ سلسلۂ مضمون مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں جب بھی عالمی ڈائجسٹ کا شمارہ آتا ہے سب سے پہلے حکیم بڈھن پر نظر پڑتی ہے۔ تسخیرِ جنات سے لے کر ہنومان جی کی پُر اسرار کہانی، مشاعرے سے لے کر شکار، طب سے لے کر نجوم اور شاعری سے لے کر اداکاری تک وہ کون سا میدان ہے جس میں حکیم بڈھن بنفسِ نفیس

ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

اور اس مردِ بزرگ کے وقائع نویس ہیں۔ حضرت بہزاد خوش نہاد، دنیا کا کوئی ذخیرۂ ادب ایسا نہیں جو اپنے چند افسانوی کرداروں کے اعتبار سے مشہور نہ ہو۔ اردو ادب میں بھی فسانۂ آزاد والے آزاد نیز خوجی اور امراؤ جان ادا کے کردار غیر فانی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا کہ حکیم بڈھن کا کردار اسی پائے کا ہے پیش از وقت ہے

اس کا فیصلہ تو صرف وقت کرے گا کہ حکیم بڈھن کا کردار ادب میں زندہ رہا یا عکسِ سراب ثابت ہوا۔ تاہم "حکیم بڈھن" کا کردار زندہ رہے یا نہ رہے حضرت بہزاد کی گفتاری ضرور زندہ رہے گی اور جہاں تک اظہار و بیان سے اس سادہ دل نشین ظرافت آمیز اور موثر اسلوب کا تعلق ہے جس کا نمونہ ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے۔ تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کر سکتا ہوں کہ یہ نثر۔ نظم سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔ اس موقع پر ایک بات عرض کر دوں۔ بہزاد صاحب انشاءاللہ لطف اندوز ہونگے۔ عرض کرنا یہ ہے کہ شعر کہنے سے مضمون لکھنے کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں اُنکے خیال میں نظم مجموعی طور سے نثر پر فوقیت رکھتی ہے مگر یہ محض ایک غلط فہمی ہے اور یہ عام غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ نظم مقید ہوتی ہے اور نثر آزاد۔ شعر کہنے کے لئے ردیف قافیے کی زنجیر سے ہاتھ باندھ لینے پڑتے ہیں اور نثر نگاری۔ انشا۔ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری کے میدان میں (بظاہر) قلم اور قلمکار۔ مطلق العنان ہوتا ہے جس راستے کی سمت چاہے مڑ جائے۔ جس موڑ پر چاہے ٹھہر جائے۔ لیکن درحقیقت یہ خیال بے بنیاد ہے شعر گوئی (بشرطیکہ روایتی انداز کی ہو) صرف ایک مشینی عمل ہے ہر قافیہ اپنی بندش، اسلوبِ ادا، اور طریقِ اظہار خود سجھا دیتا ہے۔ فرض کیجئے کسی غزل کی ردیف قافیہ ہے۔

گلستاں بنا دیا

بیاباں بنا دیا

مجھے پوری طرح اندازہ ہے کہ اس زمین میں ایک منجھا ہوا روایت پسند

شاعر بڑی آسانی سے دس پندرہ منٹ کے اندر زیادہ نہیں تو پانچ سات شعر ضرور نکال لے گا۔ لیکن - اگر وہ - اپنے خاص انداز میں کوئی نثر پارہ لکھنا چاہے تو انداز بیان کے خاص ڈھنگ، نثر کی ہمواری، عبارت کی برجستگی، لفظ اور معنی کی پیچیدگی اور ہم آہنگی (وغیرہ) کو ملحوظ رکھنے میں جو دقت پیش آئے گی وہ نظم سے زیادہ پریشان کن ہے۔ بہزاد صاحب سعی اور ارادے کے بغیر دس پانچ غزلیں ہر عالم میں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ حکیم بدھن کا سلسلۂ مضامین اتنی آسانی کے ساتھ تخلیق و بیان کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتا تھا ممکن ہے کہ خود بہزاد صاحب کو میرے اس نکتۂ خیال سے اتفاق نہ ہو۔ مگر میرا تجربہ یہی ہے بہرحال بہزاد صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ اُنکے بہار آفریں اور سحر طراز قلم نے ایک ایسے مجموعۂ مضامین کو جنم دیا ہے۔ جو اپنی تازگی، طرفگی، ندرت اور برجستگی کے تحت تادیر اردو ادب میں زندہ رہے گا۔

رئیس امروہوی

۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء

شکیل عادل زادہ

اعتراف

حکیم بڈھن کچھ عجب طرح معرض وجود میں آئے ہوا کہ یہ کہ حضرت بہزاد لکھنوی نے ۱۹۶۶ء کے وسط میں رئیس صاحب کے نام عالمی ڈائجسٹ میں اشاعت کے لئے ایک مضمون روانہ فرمایا تھا۔ میں نے اس مضمون کی مخالفت یوں کی اس میں بہزاد صاحب نے ایک ایسا واقعہ تحریر فرمایا تھا جو کسی طرح بھی قرین قیاس نہ تھا۔ مگر بعد کو دوسرے ارکان عالمی ڈائجسٹ کے اصرار پر یہ مضمون شائع کرنا ہی پڑا۔ اس کے چھپتے ہی بہزاد صاحب کی تحریر کی خوبی و خوش اسلوبی، روانی و سلاست، بے ساختگی اور دلکشی کے متعلق ادارے کو بیشمار خطوط موصول ہوتے۔

کچھ عرصے بعد بہزاد صاحب نے اپنے یار حکیم بڈھن کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلوؤں پر باقاعدہ مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جو ہر جگہ پسند کیا گیا، اور لوگ بار بار یہ سوالات کرنے لگے کہ کیا واقعی حکیم بڈھن جیسی پہلو طراز اور پہلو دار شخصیت کوئی تھی ۔ ہے یا نہیں۔ یا صرف جناب بہزاد کے زورِ قلم اور ندرتِ بیان کا کارنامہ ہے۔ حکیم بڈھن کے سلسلۂ مضامین کے بارے میں موصول ہونے والے مختلف خطوط شائع کرتے رہے، اس پر بہزاد صاحب کچھ ناراض بھی ہوئے

مگر اُنکے مضامین کی مقبولیت میں کوئی کمی نہ آئی - بلکہ یہ کچھ اور دلچسپی اور شوق سے پڑھے جانے لگے۔

حکیم بڈھن کی شخصیت اور شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں پر جتنی بھی نکتہ چینی کی جاتے وہ اپنی جگہ کسی حد تک درست ہے کہ ایسے ماورائی مزاج اور خاصہ کے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں - مگر اعتراف مجھے ہے کہ ملتے ہیں - فرق بس اتنا ہے انہیں کوئی بہزاد نہیں ملتا - بہزاد صاحب اگر حکیم بڈھن کے رفیق نہ ہوتے تو حکیم صاحب کا کارخانہ کب کا ٹھپ ہو جاتا اور حکیم بڈھن نہ ہوتے تو بہزاد صاحب اتنی خوبصورت تحریریں کیسے لکھتے، ان دونوں کے مرکب سے جو دلچسپ اور رنگا رنگ مضامین آپ پڑھنے والے ہیں - وہ اُردو میں کئی اعتبار سے منفرد خصوصیت کے حامل ہیں۔

میری طرح سے بہت سے لوگ بہزاد صاحب کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، کسے پتا تھا کہ ہمیشہ گنگنانے والے اس شاعر خوش بیاں میں نثر کی کس قدر بھرپور قوت و صلاحیت موجود ہے — ان مضامین کو پڑھئے اور بہزاد صاحب کی بیباک مسکراتی، ہنستی بولتی اور سرشار نثر پر سر دُھنیے۔

اور ہاں یہ فیصلہ کرنے میں آپ قطعی حق بجانب ہیں کہ بہزاد لکھنوی زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نثر نگار۔

شکیل عادل زادہ

آسیب زدہ دوشیزہ

بھائی حکیم بذّھن میرے ساتھ حسین آباد ہائی اسکول کے آٹھویں درجے میں پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کا نام سید مرتضیٰ حسین تھا۔ تعلیم ہی کے زمانے میں یہ یکایک غائب ہو گئے اور برآمد ہوئے تو نوابی ٹھاٹھ تھا اور مصاحبین کا ایک جم غفیر ان کے ہمراہ تھا۔ پڑھنا تو چھوٹ ہی گیا تھا لہٰذا مجھ سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بھی کلکتہ چلا گیا۔ وہاں پڑھتا رہا۔ پھر واپس پلٹا تو کچھ دنوں کے بعد ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ اُن سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ اُن کی نوابی کتنے دن چلی اور کن کن منازل سے گزری۔ اس کا مجھے کبھی علم نہ ہو سکا۔ اُن سے میری ملاقات سنہ ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ جب میں اختلاجِ قلب کے ہاتھوں تباہ حال وطن کی گلیوں میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ میں نے اپنا سا اضطراب آج تک نہیں دیکھا۔ اگر میرے اضطراب کو کوئی شئے مائلِ تسکین کرتی تھی وہ میری شاعری تھی یہی وجہ کہ میں ہر وقت گنگنایا کرتا تھا۔ لوگ مجھے مجذوب، دیوانہ، خدا جانے کیا کیا سمجھتے تھے۔ میرے خاندان نے میری کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ اُن کا خیال تھا، کہ میں شاعر بننے کے لئے یہ ڈھونگ

رچا رہا ہوں حقیقتہً بیمار نہیں ہوں۔ اس وقت میں ایک عدد بیوی اور تین عدد لڑکوں کا باپ تھا۔ آپ یقین مانیے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کہاں سے روز کے اخراجات کے لئے روپیہ لاؤں۔ میرے واسطے ہر صبح ایک قیامت اور ہر شام ایک مصیبت سے کم نہ تھی۔ اسی عالم میں ایک دن حکیم بڈھن سے ملاقات ہو گئی۔ یہ نخاس کے ایک چائے خانے میں فروکش تھے اور اُن کو گھیرے ہوئے کچھ حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پہچانے اور بولے۔

ارے بھائی بہزاد، یہ تم ہو۔ اماں کیا حال ہے تمہارا؟

میں نے مختصر الفاظ میں اپنی داستاں دہرا دی —— وہ بولے۔

بیٹھو بیٹھو، چائے پیو اور ناشتہ کرو۔ اللہ رزاق ہے گھبراؤ نہیں۔

میں بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب کے آرڈر کی فوری تعمیل ہوئی۔ میں بھوکا تو تھا ہی ڈٹ گیا۔ اس وقت جو مجمع حکیم صاحب کو گھیرے ہوئے تھا وہ ریس کھیلنے والوں کا تھا اور وہ ان سے ٹپ مانگ رہا تھا۔ حکیم بڈھن بلا کا انسان نکلا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ریس پر محققانہ گفتگو کر رہا ہے۔ اس کو ہر گھوڑے کا شجرۂ خاندانی تک یاد ہے حکیم صاحب مجمع سے فراغت حاصل کرکے میرے پاس آئے اور بولے۔

یار بہزاد تم کو شعر فروشی میں تامل تو نہیں ہو گا۔

میں نے اُن سے کہا۔

شعر کون خریدے گا؟

انہوں نے کہا۔

تم کو اس سے کیا مطلب، کالا چور ہو گا۔

میں نے کہا۔

واقعی مجھے مطلب نہیں ہے۔

وہ رازدارانہ انداز سے مجھ سے سرگوشی میں بولے۔

بھائی میرے —— میرے پاس بہت سے ٹٹ پونجیے شعراء آیا کرتے ہیں۔ کلام سنا کر میرا مشورہ حاصل کرتے ہیں انہیں میں سے کسی کو تم سے ٹکرا دوں گا۔

واقعی جناب تھوڑی دیر کے بعد شعرائے کرام یکے بعد دیگرے حکیم صاحب کے پاس آنا شروع ہو گئے —— یہ سب کے سب تھے تھرڈ کلاس، اے لیجئے چائے خانے میں شعر خوانی شروع ہو گئی۔ حکیم صاحب لہک لہک کر داد دینے لگے۔ مجھے حیرت یہ ہو رہی تھی کہ یہ ظالم شعر فہمی میں بھی کم نہیں۔ بعض اشعار پر خاموش ہو جاتا اور شاعر کو الگ لے کر اس شعر کا مفہوم سمجھاتا۔ غرض اس شاعر کو اپنا مرید کر لیتا۔ دن گزر گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ مجھے حکیم بدمشق نے ایک مصرع طرح دیا۔ اور تیرا۱۳ اشعار کی غزل لکھوا کر ایک روپیا مرحمت فرما دیا۔ مقطع کے واسطے انہوں نے حکم دیا کہ میں ایک چو حرفی لفظ کی جگہ چھوڑ دوں خواہ پہلے مصرع میں یا دوسرے مصرع میں، وہ تخلص خود فٹ کریں گے۔ چلئے جناب اللہ تعالیٰ نے میرے اخراجات کی ایک سبیل نکال دی —— یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ میں علی الصباح نماز سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچ جاتا۔ دن بھر حکیم صاحب کے کارناموں کو دیکھتا، شام کو ایک غزل لکھ کر ایک روپیا لیتا اور گھر چلا آتا، یہاں تک کہ دو ماہ گزر گئے۔ مکان دار کا کرایہ دو ماہ کا پہلے ہی واجب الادا تھا۔ یہ مزید دو ماہ

میرے واسطے اور مصیبت بن گئے۔ صبح و شام مکان دار کا آدمی تقاضے کیلئے آتا، اس ایک روپے میں اتنی وسعت کہاں تھی کہ کرایہ بھی ادا ہو جاتا۔ ایک دن میں پریشان سا ہوٹل بہ پہنچا۔

حکیم بڈھن نے دیکھتے ہی پوچھا۔

کیوں جی کیا معاملہ ہے پریشان نظر آرہے ہو۔

میں نے ساری مصیبت بیان کر دی۔

بولے۔

تمہارے اور بچوں کے لئے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔

میں نے کہا۔

ہے تو، لیکن پہلا معاملہ تو دکاندار کا ہے۔

وہ بولے۔

گھبراؤ نہیں اللہ مالک ہے۔

میں خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ایک صاحب ہوٹل میں داخل ہوئے اور لپکتے ہوئے حکیم صاحب سے بغل گیر ہو گئے۔

حکیم صاحب بھی بیحد تپاک سے ملے اور بولے۔

ارے بھئی مرزا جی کہاں ہو، مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی۔

وہ بولے۔

بھائی بڈھن — لکھنؤ تو چھوٹ گیا لیکن پیٹ کی روٹی تو چل گئی۔ آجکل چودھری چنگو میاں کا مصاحب ہوں۔

وہ بولے۔

تو گویا تعلقے پر رہتے ہو۔

انہوں نے کہا۔

ہاں اور وہاں سے سیدھا تمہارے ہی پاس بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ شام بجے کو واپس جانا ہے۔

حکیم صاحب نے کہا۔

بولو کیا کام ہے میں تمہارے ہر کام کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں۔

مرزا جی نے کہا۔

ذرا خلوت میں چلو تو بتاؤں۔

حکیم صاحب اور مرزا جی دونوں چائے خانے کے باہر چلے گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے میں واپس آگئے۔ دونوں میں کیا باتیں ہوئیں میں لاعلم رہا۔ مرزا جی کے رخصت ہوتے وقت حکیم بڈھن نے کہا۔

مرزا جی تم اطمینان رکھو۔ کل صبح ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔ تم اسٹیشن پر بیل گاڑی لئے ہوئے موجود رہنا۔

مرزا جی کے جانے کے بعد حکیم صاحب نے مجھ سے کہا۔

بھائی بہزاد، کل تم میرے ساتھ باہر چل رہے ہو۔ انشاءاللہ تمہاری پریشانیاں دور ہو جائیں گی، بستر اور کپڑوں وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم انہیں کپڑوں میں چلنا۔

علی الصباح حسب معمول میں چائے خانے پہونچا۔ حکیم صاحب میرے

منتظر تھے۔ آج ان کے ٹھاٹھ دوسرے تھے۔ جامدانی کا انگرکھا، دوپلی ٹوپی، سیاہ پمپ اور سنہری عینک میں وہ بیحد سج رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور ایک ہولڈال چائے خانے کے بیرونی حصے میں رکھا ہوا تھا۔ تانگہ بلوا کر حکیم صاحب پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گئے، میں تانگے والے کے برابر بیٹھ گیا۔ تانگہ اسٹیشن کی طرف چلا، حکیم صاحب بالکل خاموش تھے۔ میں بھی خاموش رہا۔ اسٹیشن پہونچکر میں نے قلی کو اشارہ کیا۔ سامان قلی پر رکھوایا، حکیم صاحب ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے، میں رکا۔ خیال یہ تھا کہ میرا ٹکٹ تھرڈ کا ہوگا لیکن حکیم صاحب نے بستر اور ہولڈال رکھوا کر مجھ سے کہا۔

آتے کیوں نہیں۔ تمہارا ٹکٹ بھی سیکنڈ کلاس ہی کا ہے۔

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ڈبّا بالکل خالی تھا۔

گاڑی کی روانگی تک حکیم صاحب خاموش رہے گاڑی چلی تو مجھ سے بولے۔

بہزاد! دنیا میں روپیا کمانا بہت مشکل کام ہے۔ تم سے مجھے جو ہمدردی ہے اس کو بیان نہیں کر سکتا، تم ہی میرے ایک واحد دوست ہو۔ یوں تو ہزاروں شناسا ہیں۔ لیکن مجھے کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں نے کہا۔

میں تمہارا واقعی ممنون ہوں۔ میری پریشانیاں، تمہاری وجہ سے بہت کم ہو گئی ہیں۔

گاڑی چلنے کے بعد حکیم صاحب نے پہلی بار زبان کھولی اور کہا۔

سنو بہزاد! دنیا میں روپیا کمانا بہت مشکل بھی ہے اور بہت آسان بھی۔

میں نے کہا۔

مشکل کا علم تو مجھکو ہے لیکن آسانی کا علم تم کو ہو گا۔

وہ بولے۔

ارے بھائی میں مطلب کی بات پر آ رہا ہوں یہ تو تھی تمہید ــــ تم کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

میں نے کہا۔

تم نے اس راز کو کھولا ہی نہیں تو میں کیا سمجھتا۔

وہ بولے۔

ارے بھائی وہ جو مرزا جی آئے تھے وہ ایک بہت بڑے تعلقدار ہینگنی میاں صاحب کے مصاحب خاص ہیں اور میرے بہت گہرے دوست، معاملہ یوں ہے کہ چودھری صاحب کی ایک ہی لڑکی ہے اور اس پر جنات آنے لگے ہیں۔ قرب و جوار کے تمام عامل بلائے جا چکے ہیں لیکن وہ سب ناکام ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب نے مرزا جی کو کل لکھنؤ سے کسی بڑے عامل کو بلانے کے لئے بھیجا تھا۔

میں نے کہا۔

تو ان کو منجو صاحب رمّال کا نام بتا دیا ہوتا ــــ وہی بہت مشہور ہیں یا شاہ محمود میاں کا، ان کی بھی بڑی شہرت ہے۔

حکیم بڈھن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے ان سے بھی بڑے عامل کا نام بتا دیا۔

کس کا؟ ـــــ میری رائے میں تو کوئی اور لکھنؤ میں مشہور عامل نہیں ہے۔

وہ بولے۔

اس عامل کا نام ہے بہزاد شاہ!

میں نے کہا۔

کیوں بکتے ہو۔ مجھے جن آسیب وغیرہ کے عمل سے کیا واسطہ!

وہ بولے۔

واسطہ ہو یا نہ ہو اس وقت تو جناب بہزاد شاہ صاحب جن اُتارنے کے لئے سیکنڈ کلاس میں بیٹھے ہوئے تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کی پیشوائی کے لئے مرزا جی اسٹیشن پر موجود ہوں گے۔

میں گھبرا گیا، میں نے کہا۔

بھائی حلیم بدھن ـــــ یہ تم کیا کہہ رہے ہو، بخدا مجھ کو جن، آسیب بھوت پریت کے متعلق کچھ علم ہی نہیں ہے۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو ان کے ذکر ہی سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

وہ بولے۔

یار تم نرے گاودی ہو۔ ارے بھائی یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم، جن، آسیب اور بھوت سے قطعی ناواقف ہو۔ لیکن میاں روپیا کمانے کے ڈھنگ سیکھو۔

میں نے کہا۔

وہ کہا؟

وہ بولے

ارے بھائی تم مرزا جی کی دعوت چکھ رہے ہو۔ تو تفریح اور تکریم کا مزہ اٹھاؤ۔ کچھ سوچا کر دینا۔ جنات تم سے اُتریں گے تو خاک، بڑے بڑے عاملین ناکام ہو چکے ہیں۔ بہر نوع تمہاری زحمت کا معاوضہ تم کو مل ہی جائے گا۔ تم نے کل ہی مجھ سے مکان کے کرائے کا ذکر کیا کہ چڑھ گیا ہے۔ کپڑوں کی ضرورت میں نے محسوس کی تھی۔ چلو ایک موقع کمائی کا نکل آیا۔ میں نے سوچا کہ تم کو کیا دوں۔ اس کو کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ بڑا گھر ہے۔ لاکھوں لُٹ رہے ہیں تمہارے نصیب کا تم کو بھی مل رہے گا۔

میں نے کہا۔

حکیم صاحب یہ تو صحیح ہے۔ لیکن جب وہ مجھ کو اس جنات زدہ لڑکی کے پاس بھیجیں گے۔ تو میرا کیا حشر ہو گا ـــــ میں نے سنا ہے جنات عاملوں کو پٹخنیاں تک دے ڈالتے ہیں اور بری طرح مارتے ہیں۔

انھوں نے کہا۔

تم تو خواہ مخواہ کے پٹھان ہو۔ ڈر کے مارے دم نکلا جاتا ہے تم باقی حالات مجھ پر چھوڑ دو۔ لیکن تم میری باتوں کو کاٹنا نہیں، جو کچھ میں کہتا ہوں خاموشی سے سنتے رہنا۔

میں نے کہا۔

حکیم صاحب میرا تو محض سوچ سوچ کر ہی دم نکلا جاتا ہے۔

وہ بولے۔

اب تو تم کو یہ سب بھگتنا ہی ہوگا۔ سوچ سوچ کر دل چھوٹا نہ کرو۔

میں خاموش ہوگیا۔ مگر میری دہشت بڑھ گئی۔ میرا ہاتھ گریبان پر تیز تیز چلنا شروع ہوگیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں نہ جاؤں اور کسی اسٹیشن پر اتر پڑوں۔ لیکن پاس ایک پیسا بھی نہیں تھا، واپسی کیونکر ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ ایک مہینا رونہ کا لالچ تھا کہ یہ آمدنی جاتی رہے گی اور گھر کے اخراجات کا کیا حشر ہوگا۔ میں انہیں تفکرات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ حکیم صاحب نے کہا۔

اٹھو یا منزل آگئی۔

میں اٹھا۔ حکیم صاحب نے اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور ہولڈال پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ ہم دونوں اتر آئے۔ اتنے میں ایک طرف سے مرزا جی لپکتے ہوئے نظر آئے۔ آتے ہی حکیم صاحب سے بغل گیر ہوئے اور میرے ہاتھ چومنے لگے۔ ان کے ایک ساتھی نے ہولڈال اور سوٹ کیس تھام لیا۔ اسٹیشن کے باہر ایک بیل گاڑی منتظر تھی۔ اس میں پہلے میں، میرے بعد حکیم صاحب اور پھر مرزا جی بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی ——— تقریباً ایک میل کی مسافت پر ایک بڑی سی حویلی نظر پڑی۔ جس کے دروازے پر متعدد آدمی کھڑے ہوئے تھے ——— وہ بیل گاڑی کو آتا دیکھ کر دوڑے، ہم لوگ اتر لئے گئے، اور ایک بڑے کمرے میں پہونچا دیئے گئے۔ کمرے میں تختوں کے چوکے کا فرش تھا جس پر ایک مسند بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ چوکے کے چہار جانب کرسیاں پڑی ہوئی

تھیں۔ مرزا صاحب نے مجھے اور حکیم صاحب کو مسند پر بٹھایا اور کہا۔۔

چودھری صاحب ابھی تشریف لاتے ہیں۔

ان کی گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک قد آور لحیم شحیم صاحب کمرے میں داخل ہوئے، یہ سفید ململ کا کرتا، اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ چہرے پر امارت کا رعب تھا۔

مرزا جی نے کہا۔

حکیم صاحب چودھری صاحب تشریف لے آئے۔

حکیم صاحب نے بڑھ کر چودھری صاحب سے ہاتھ ملایا۔

چودھری صاحب نے بیٹھتے ہی کہا۔

شاہ صاحب کہاں ہیں؟

حکیم صاحب نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شاہ صاحب سے ملئے چودھری صاحب!

چودھری صاحب نے مجھ سے مصافحہ تو کر لیا لیکن غالباً ان پر میری شخصیت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ حکیم بدھن سمجھ گئے اور بولے۔

چودھری صاحب آپ ان کے حلیئے پر نہ جائیے۔ ان کے ظاہر پر نظر نہ کیجیے میں ان کے کارنامے اگر سنا دوں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ یہ چھپے ہوئے رستم ہیں رستم، چودھری صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ چائے آ گئی، ناشتہ لگ گیا حکیم بدھن نے خوب بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارے۔ لیکن میں بیحد متفکر تھا۔ لہذا بہت کم کھا سکا۔ میں دل ہی دل میں بیحد خوش تھا کہ چودھری صاحب مجھ سے

مطمئن نہیں ہیں۔ بہت اچھا ہے۔ خدا کرے یہ حکیم صاحب کی باتوں میں نہ آئیں اور مجھے یوں ہی واپس کر دیں۔ ناشتے کے بعد چودھری صاحب نے کہا۔

جناب حکیم صاحب! آپ نے بڑا کرم فرمایا کہ آپ خود تشریف لائے اور شاہ صاحب کو بھی آنے کی زحمت دی۔ لیکن میں اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مکمل واقعات آپ کو سنا دوں۔ اس کے بعد اگر آپ مریضہ پر ہاتھ ڈال سکیں تو تو ڈالیے ورنہ آپ میرے یہاں تشریف لائے ہیں یہ میرے نصیب۔ جب تک جی چاہے عزت بخشئے۔ اصل میں جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔

حکیم بڈھن نے کہا۔

ارشاد، ارشاد یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ پہلے سے آگاہ کیے دے رہے ہیں۔

چودھری صاحب بولے۔

جناب حکیم صاحب! یہ میری اکلوتی بچی ہے ـــــ ماشاء اللہ صورت شکل میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو قرب وجوار میں دور دور ایسی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے اس کی شادی اپنے بھتیجے کے ساتھ طے کر دی ہے۔ وہ لڑکا بھی اچھا ہے اور گھر ہی کا بچہ ہے لیکن جس دن منگنی ہوئی۔ اسکے دوسرے ہی روز سے لڑکی پر جن آنا شروع ہو گئے۔ میں نے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھ کر قرب وجوار سے تمام عاملین کو بلوایا لیکن جو بھی آیا وہ ناکام ہی نہیں جنات کے ہاتھوں پٹ کر واپس ہوا۔ کل ہی ایک مولوی صاحب آئے تھے ـــــ لیکن جنات کا سامنا ہوتے ہی بیہوش ہو گئے۔ بمشکل تمام اُن کو اُن کے گاؤں واپس

کہا ہے۔ آپ سمجھ بوجھ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے ان شاہ صاحب کو کوئی گزند میرے یہاں پہنچ جائے تو مجھے سوائے شرمندگی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسرے ان کی وضع قطع بھی عاملین جیسی نہیں ہے۔ معاف فرمائیے گا۔ مجھے یہ جناب شاہ صاحب جچے نہیں۔

اُن کے اس بیان کو سن کر میری روح فنا ہو گئی۔ میرا اختلاجی عالم اس درجہ بڑھا کہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ حکیم بدھن اس پر راضی ہو جائیں کہ وہ ایسی ہی میں عافیت ہے۔ لیکن حکیم بدھن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جناب چودھری صاحب! میں بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے سارے معاملات صاف صاف بیان کر دیئے۔ آپ شاہ صاحب سے مطمئن نہیں ہو رہے۔ آپ ان کا یہ عالم دیکھ رہے ہیں۔ ایک دم سے یہ گھبرا کر اٹھے اور ٹہلنے لگے ہیں۔ یہ حضرت اپنے موکلین سے سرگرمِ گفتگو ہیں۔ ارے چودھری صاحب آپ اس شخص کو نہیں جانتے میرا تو لنگوٹیا دوست ہے۔ یہ اور ہم ساتھ پڑھتے تھے ورنہ حضرت تعلیم ختم کرنے کے بعد ریلوے میں ٹی آئی ہو گئے اور وہاں بنگال کسی شخص سے عملیات کی تعلیم لی اور اعمال پر اتنا زور دیا کہ ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ مدت بعد سکون تو ہو گیا لیکن اب بھی وہی لہک باقی ہے۔ آپ ان کی گھریاں گیریاں نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کا عالم یہ ہے کہ کسی قسم کا آسیب یا جن ہو یہ منٹوں میں اتار دیتے ہیں۔ لیکن ان کاموں کے لئے تیار نہیں ہوتے اور نہ پیشہ کرتے ہیں۔ مست آدمی ہیں۔ ارے میاں اس شخص کا ادنیٰ کمال یہ ہے کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بننا[15] دور ہو سکے

ایک صاحب کی بیوی پر جنات آتے تھے، وہ میرے پاس آئے اور رونے لگے میں ان کو تسلی دی اور ان کو کچھ بتائے بغیر ساتھ لے لیا۔ ان حضرت نے جوں ہی گھر میں قدم رکھا ان کی بیوی پر جنات صاحب وارد ہو گئے اور لگے اُول فول بکنے ـــ انہوں نے دیکھتے ہی کہا کیوں ڈھونگ رچا رہی ہے جھوٹی، ٹھیک سے ہوش میں آجا نہیں تو سارا جسم پھونک دوں گا ـــ وہ نہ ماننا تھا نہ مانی۔ یہ میرے ہمراہ چلے آئے۔ مجھ کو بھی شرمندگی سی ہوئی کہ لیں ان کو بہت کچھ سمجھے ہوئے تھا لیکن یہ تو نرے کودن نکلے۔ ہوٹل میں آئے بہ مشکل تمام ایک گھنٹہ گزرا تھا کہ وہی صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور لگے قدموں پر گر پڑے کہ حضرت معاف فرمایئے آپ کے آتے ہی میری بیوی چیخنے چلانے لگی ـــ جلی جلی جلی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے جسم پر آبلے نظر آنے لگے ہیں۔ وہ توبہ کر رہی ہے اور آپ کو بلا رہی ہے، خدا کے واسطے چلئے، یہ جانا نہیں چاہتے تھے لیکن میرے اصرار پر راضی ہو گئے۔ جب وہاں پہونچے تو واقعی عورت کا برا حال تھا۔ اس نے قبول کر وہ ڈھونگ کرتی تھی اس کے بھائی کے گھر شوہر نے آنے جانے کو منع کر دیا تھا۔ لہذا وہ شوہر کو تنگ کر رہی تھی۔ انہیں نے کچھ پڑھ کر دم کیا، کہ عورت کے آبلوں پر لگایا جائے اور چلے آئے۔ دوسرے دن وہی آدمی آیا اور مٹھائی کا ٹوکرا ساتھ تھا۔ وہ انکی خدمت میں اندر گیا اور بولے وہ آبلے وغیرہ سب ٹھیک ہو گئے تو جناب چودھری صاحب آپ مطمئن رہیں۔ اگر جنات ہے تو جائیگا۔ رک نہیں سکتا، اور اگر نہیں ہے تو معاف کیجئے گا صاحبزادی کے جسم میں آبلے ہی آبلے نظر آئیں گے۔ چودھری صاحب اس بیان کے

بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

جناب شاہ صاحب میں اپنی اگلی گفتگو کی معافی چاہتا ہوں۔ آرام سے تشریف رکھئے۔ آج آپ کو تکان ہے کل انشاء اللہ آپ کو علاج کی زحمت دی جائیگی دوپہر کو چودھری صاحب کے وہاں سے جو کھانا آیا وہ واقعی پر تکلف تھا۔ حکیم بڈھن تو دیکھ کر کھل گئے۔ لیکن میں اپنی پریشانی کے باعث سکون سے نہ کھا سکا مجھے جن کا خوف پریشان کر رہا تھا۔ میں نے آج تک جنات زدہ آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ قصے سنے تھے اور وہ خوفناک ــ مجھے کوفت یہ ہو رہی تھی کہ چودھری صاحب نے بچ نکلنے کا ایک راستہ دیا۔ لیکن خدا جانے کیوں حکیم بڈھن نے فائدہ نہیں اٹھایا ــ اور مجھے اس آگ میں جھونک دیا۔ میں ایسے پیسے سے باز آیا جس میں خون خرابے تک کی نوبت آجائے۔ ادھر چودھری صاحب اور حکیم بڈھن میں بڑی گاڑھی چھن رہی تھی۔ چودھری صاحب کو اپنی موسیقی دانی پر ناز تھا اور حکیم بڈھن نے موسیقی پر ایسی عجیب تقریر کی کہ وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ چنانچہ آج رات کو محفل موسیقی کیلئے احکام صادر ہو گئے تھے۔ چودھری صاحب حکیم بڈھن کے بہت گرویدہ نظر آرہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح موقعہ ملے تو میں حکیم بڈھن کو آڑے ہاتھوں لوں اور کہوں کہ آخر یہ کونسی دوستی ہے کہ میری جان آفت میں پھنسا رہے ہو۔ لیکن مجھے کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ چودھری صاحب کھانے کے بعد دوپہر کو آرام کے لئے زنان خانے بھی نہیں گئے۔ اور اب شطرنج پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب اس فن میں بھی تبحر کا اظہار کر رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں تاؤ کھا کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔ نماز کے بعد میں تا دیر دعا کرتا رہا کہ میری

جان کسی صورت سے اس بلا سے محفوظ اور مامون رہے۔ یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت ہو گیا۔ چائے آ گئی اور پیا باہر بلا لیا گیا۔ چائے کے بعد حکیم بدھن نے کہا۔

چلئے شاہ جی ذرا ادھر ادھر ٹہل آئیں۔

مجھے کیا عذر تھا۔ میں تو خود یہ چاہتا تھا کہ گفتگو کا تنہائی میں موقع ملے ہم دونوں حویلی سے کھیتوں کی جانب روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر حکیم بدھن نے کہا۔

یار تم مجھ پر ناحق تاؤ کھا رہے ہو۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہا ہوں اور تم ناراض نظر آ رہے ہو۔

میں نے کہا۔

میرا اچھا بھلا چاہ رہے ہو۔ میرے ہاتھ پیر تڑوانا چاہ رہے ہو اور کچھ بھی نہیں۔ اس جن زدہ لڑکی کا حال اس کا باپ بتا چکا ہے کہ تقریباً ہر عامل کو اس نے مار پیٹا ہے۔ میں تو کوئی عامل بھی نہیں ہوں۔ جب عاملین اپنی حفاظت نہ کر سکے تو میں کیا کر لوں گا۔

وہ بولے۔

اے کچھ!

میں نے کہا۔

ہاں اور یہ کہ جب چودھری صاحب نے تم کو یہ موقع دیا تھا کہ ہم اس کام میں ہاتھ نہ ڈالیں تو ہم آسانی سے بچ سکتے تھے۔ آخر تم نے ایک بے سر و پا کہانی سنا کر کیوں مجھے پھانس دیا۔

وہ بولے۔

استاد! تم بڑے شاعر ہو۔ تم بہار و خزاں کا ترانہ نظم کر سکتے ہو۔ شب ہجر میں تارے گن گن کر سحر کر سکتے ہو۔ گلستان و قفس کا جوڑ ملا سکتے ہو۔ لیکن ذرا سی بات سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے کہا۔

وہ ذرا سی بات کیا ہے۔

کہنے لگے۔

لڑکی ڈھونگ کر رہی ہے۔ جن وِن خاک نہیں ہے۔

میں نے کہا۔

تم کو کیسے معلوم ہوا؟

وہ بولے۔

استاد! میرے شاگرد ہو تو تم کو بھی یہ گُر آجائے۔ ارے کل چودھری صاحب کی گفتگو کو تم نے غور سے نہیں سنا۔ ارے بھئی لڑکی اپنے چچازاد بھائی سے منگنی کے دوسرے دن سے جن زدہ ہوئی ہے کیا سمجھا

میں نے کہا۔

کچھ نہیں سمجھا۔

وہ بولے۔

شاعر ہو نا، وہ مصرع جوڑ لیتے ہو لیکن بات کی تہہ کو نہیں پہنچتے۔ ارے میاں لڑکی اس شادی کی مخالف ہے اس لئے ڈھونگ رچا رہی ہے۔ اب آیا سمجھ شریف میں۔

بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

جناب شاہ صاحب میں اپنی اگلی گفتگو کی معافی چاہتا ہوں۔ آرام سے تشریف رکھئے۔ آج آپ کو تکان ہے کل انشاءاللہ آپ کو علاج کی زحمت دی جائیگی دوپہر کو چودھری صاحب کے وہاں سے جو کھانا آیا وہ واقعی پر تکلف تھا۔ حکیم بڈھن تو دیکھ کر کھل گئے۔ لیکن میں اپنی پریشانی کے باعث سکون سے نہ کھا سکا مجھے جن کا خوف پریشان کر رہا تھا۔ میں نے آج تک جنات زدہ آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ قصے سنے تھے اور وہ خوفناک ــــ مجھے کوفت یہ ہو رہی تھی کہ چودھری صاحب نے بچ نکلنے کا ایک راستہ دیا۔ لیکن خدا جانے کیوں حکیم بڈھن نے فائدہ نہیں اٹھایا ــــ اور مجھے اس آگ میں جھونک دیا۔ میں ایسے پیسے سے باز آیا جس میں خون خرابے تک کی نوبت آجائے۔ ادھر چودھری صاحب اور حکیم بڈھن میں بڑی گاڑھی چھن رہی تھی۔ چودھری صاحب کو اپنی موسیقی دانی پر ناز تھا اور حکیم بڈھن نے موسیقی پر ایسی عجیب تقریر کی کہ وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ چنانچہ آج رات کو محفل موسیقی کیلئے احکام صادر ہو گئے تھے۔ چودھری صاحب حکیم بڈھن کے بہت گرویدہ نظر آ رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح موقعہ ملے تو میں حکیم بڈھن کو آڑے ہاتھوں لوں اور کہوں کہ آخر یہ کونسی دوستی ہے کہ میری جان آفت میں پھنسا رہے ہو۔ لیکن مجھے کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ چودھری صاحب کھانے کے بعد دوپہر کو آرام کے لئے زنان خانے بھی نہیں گئے۔ اور اب شطرنج پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب اس فن میں بھی تبحر کا اظہار کر رہے تھے۔ میرا دل ہی دل میں تاؤ کھا کر موقعہ کمرے میں چلا گیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔ نماز کے بعد میں تادیر دعا کرتا رہا کہ میری

جان کسی صورت سے اس جن سے محفوظ اور مامون رہے۔ یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ چائے آ گئی اور بیٹا باہر بلا لیا گیا۔ چائے کے بعد حکیم بدھن نے کہا۔

چلئے شاہ جی ذرا ادھر ادھر ٹہل آئیں۔

مجھے کیا عذر تھا۔ میں تو خود اسے چاہتا تھا کہ گفتگو کا تنہائی میں موقع ملے ہم دونوں حویلی سے کھیتوں کی جانب روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر حکیم بدھن نے کہا۔

یار تم مجھ پر ناحق تاؤ کھا رہے ہو۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہا ہوں اور تم ناراض نظر آ رہے ہو۔

میں نے کہا۔

میرا اچھا بھلا چاہ رہے ہو۔ میرے ہاتھ پیر تڑوانا چاہ رہے ہو اور کچھ بھی نہیں۔ اس جن زدہ لڑکی کا حال اس کا باپ بتا چکا ہے کہ تقریباً ہر عامل کو اس نے مار بیٹھا ہے۔ میں تو کوئی عامل بھی نہیں ہوں۔ جب عاملین اپنی حفاظت نہ کر سکے تو میں کیا کر لوں گا۔

وہ بولے۔

اور کچھ!

میں نے کہا۔

ہاں اور یہ کہ جب چودھری صاحب نے تم کو یہ موقع دیا تھا کہ ہم اس کام میں ہاتھ نہ ڈالیں تو ہم آسانی سے بچ سکتے تھے۔ آخر تم نے ایک بے سرو پا کہانی سنا کر کیوں مجھے پھانس دیا۔

وہ بولے۔

استاد! تم بڑے شاعر ہو۔ تم بہار و خزاں کا افسانہ نظم کر سکتے ہو۔ شبِ ہجر میں تارے گن گن کر سحر کر سکتے ہو۔ گلستان و قفس کا جوڑ ملا سکتے ہو۔ لیکن ذرا سی بات سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے کہا۔

وہ ذرا سی بات کیا ہے۔

کہنے لگے۔

لڑکی ڈھونگ کر رہی ہے۔ جن وِن خاک نہیں ہے۔

میں نے کہا۔

تم کو کیسے معلوم ہوا؟

وہ بولے۔

استاد! میرے شاگرد ہوتے تو تم کو بھی یہ گُر آ جاتے۔ ارے کمبخت چودھری صاحب کی گفتگو کو تم نے غور سے نہیں سنا۔ ارے بھئی لڑکی اپنے چچا زاد بھائی سے منگنی کے دوسرے دن سے جن زدہ ہوئی ہے کیا سمجھا

میں نے کہا۔

کچھ نہیں سمجھا۔

وہ بولے۔

شاعر ہو نا، وہ مصرع جوڑ لیتے ہو لیکن بات کی تہہ کو نہیں پہنچتے۔ ارے میاں لڑکی اس شادی کی مخالف ہے لہٰذا یہ ڈھونگ رچا رہی ہے۔ اب آیا سمجھ شریف میں۔

میں نے کہا۔

اچھا چلو مان لیا، اور جو یہ عاملین کی پٹائی ہوتی ہے۔

وہ بولے۔

یہ دوسرا ثبوت ہے ڈھونگ کا۔

میں نے کہا۔

میں نہیں سمجھا۔

وہ بولے۔

بھائی عاملین کلام پاک کی آیات ہی تو تلاوت کر کے جن کو زیر کرتے ہیں۔ وہاں جن ہو تو زیر ہو۔ ان کی تلاوت بیکار جاتی ہے جس سے وہ گھبرا جاتے ہیں اور ادھر لونڈیا مار کٹائی شروع کر دیتی ہے۔ امیر کی لڑکی ہے۔ ان کو جواب میں مارنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مار کھا لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ زیادہ معاوضے کی امید بھی ہو جاتی ہے جو زیادہ پٹتا ہے اس کو زیادہ ملتا ہے۔ میں نے چودھری صاحب سے باتوں باتوں میں یہ معلوم کر لیا کہ کس کو کتنا روپیہ دیا گیا۔

میں نے کہا۔

"چلو بات یہ بھی دل کو لگ رہی ہے۔ لیکن تم نے یہ بے سر و پا کہانی کیوں سنائی تھی جس میں، میں نے اس عورت کے جسم میں آبلے ڈال دیئے تھے۔

حکیم بدھن بولے۔

یہ میں نے دانستہ من گھڑت برجستہ کہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ گھر کی مستورات تک تمہارا یہ فرضی کارنامہ پہنچ جائے۔ اندر صاحبزادی بھی سن لیں اور ڈر جائیں گی کہ

اب کی زبردست عامل سے سابقہ پڑا ہے۔ کل انشاء اللہ تم یہ جن اُتار لو گے۔

میں نے کہا۔

یار بڈھن تم سے جیتنا مشکل ہے۔ تم تو اس طرح معاملہ صاف کر دیتے ہو کہ عقل حیران رہ جائے۔ لیکن میرے بھائی مجھ سے یہ جن اُتارنے کا کام نہیں ہو سکے گا۔ محض کل کے خوف سے تم دیکھو میرا برا حال ہے۔ اختلاج کے مارے میں کانپ رہا ہوں۔ میرے ہاتھ گریبان پر تیزی سے چل رہے ہیں۔

وہ بولے۔

یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ صاحبزادی تمہاری یہ کیفیت دیکھ کر اور بھی ڈریں گی کہ یہ عامل صاحب تو خود جن زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے بلند قہقہہ لگایا اور بولے۔ استاد دیکھتے جاؤ۔ میں ابھی واپسی میں ایک اور پھلجھڑی چھوڑنے والا ہوں۔ اس کے بعد صاحبزادی تمہارے سامنے اگر ہاتھ جوڑے ہوئے نہ نظر آئیں تو بھائی میری مونچھیں مونڈ دینا۔

میں جواب دیتا تو کیا دیتا۔ اگر بھاگتا تو کوئی صورت نہیں تھی۔ پیسا پاس تھا نہ راستے کا علم سوائے ٹھہرنے اور اس معاملے کو آخر تک نپٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا حکیم بڈھن نے تو مجھے قائل کر دیا تھا لیکن میرا خوف کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

ہم واپس آئے تو چودھری صاحب اپنے مصاحبین کے درمیان تشریف فرما تھے۔ حکیم بڈھن کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور بولے۔

بھائی حکیم صاحب آپ کی جدائی تو ایک لمحے کو گوارا نہیں ہوتی۔ آپ کہاں سا ٹہل آئے۔

وہ بولے۔

چودھری صاحب ادھر ہی کھیتوں کی طرف تھا۔ شاہ صاحب کل ایک ایک کچھ احکام صادر کر رہے تھے۔ وہ مجھے آپ کو بتانا ہیں۔

چودھری صاحب بولے۔

فرمایئے۔

حکیم بدھن نے کہا۔

ایک بڑا کڑھاؤ چاہیئے لیکن وہ زنان خانے کا ہی ہونا چاہیئے۔

وہ بولے۔

انا درد موجود ہے۔

حکیم بدھن نے کہا۔

ٹھیک ہے۔ وہ کڑھاؤ منجوا لیں۔ وہ زنان خانے ہی میں رکھا ہوا سرسوں کا تیل اتنا چاہیئے کہ وہ کڑھاؤ لبریز ہو جائے۔

وہ بولے۔

گھر میں سرسوں تیل اللہ کے فضل سے موجود ہے۔

حکیم بدھن نے کہا۔

اور اس تیل کو کھولانے کے لیئے لکڑی بھی زنان خانے کی بھری ہونی چاہیئے

چودھری صاحب نے حیرت سے کہا۔

یہ کیا ہوگا؟

حکیم صاحب نے جواب دیا۔

چودھری صاحب کل شاہ صاحب اس جن کو کھینچتے ہوئے تہہ خانے میں جلا دیں گے۔ یہ تیں صبح سے گڑھا وہیں چڑھا دیا جائے۔ اور ہاں زنان خانے میں ہی رکھی ہوئی سرخ مرچ آدھ سیر باریک پسوا لیجئے۔

چودھری صاحب نے پوچھا۔

مرچوں کا کیا ہوگا؟

حکیم صاحب نے کہا۔

یہ مرچیں جن زدہ کی آنکھوں اور کانوں میں ڈالی جاتی ہیں جن سے جن گھبرا کر جسم سے باہر آجاتا ہے اور اس کو گڑھا وہیں عامل اپنی قوت سے پھینک کر جلا دیتا ہے۔ براہ کرم آپ یہ احکام اندر پہونچا دیں۔ تا کہ کل صبح ہر چیز تیار ملے اور ہاں ایک بڑے کمرے میں صاحبزادی اور شاہ صاحب تنہا چھوڑ دیئے جائیں کوئی آس پاس نہ ہونا چاہیئے ــــ وہیں پر گڑھا ہونا چاہیئے اور ان مرچوں سے بھری ہوئی ایک رکابی۔

چودھری صاحب فوراً زنان خانے میں ان چیزوں کی تیاری کے احکام دینے کے لیے چلے گئے اور باہر آ کر بولے۔

صبح سب چیزیں انشااللہ تیار ملیں گی۔ میں خود چودھرائن صاحبہ کو سمجھا آیا ہوں۔ لیکن حکیم صاحب لڑکی بھی وہاں بیٹھی تھی۔ یہ باتیں سن کر ڈر سی گئی۔

حکیم صاحب نے کہا۔

ظاہر ہے خوف کی بات ہے۔ جن کو اب پتا چلا ہو گا کہ کسی زبردست عامل سے واسطہ پڑ رہا ہے۔

میں ان عجیب و غریب احکام کو سن کر چکرا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک مسئلہ تھا کمرے میں اس جن زدہ لڑکی کی ہمراہی۔۔۔ بقول حکیم صاحب اگر وہ ڈھونگ کر رہی تھی تو بھی نہ میں مرچیں آنکھوں اور کانوں میں جھونک سکتا تھا اور نہ میں زندہ جلا سکتا تھا۔ میرے ہوش و حواس بے قابو تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مغرب کی نماز کے بعد دعائیں مانگنا شروع کیں۔ مغرب کے بعد ہی دسترخوان چن دیا گیا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان کھانے سے فراغت ہو گئی۔ کھانا واقعی بے حد عمدہ تھا۔ چودھری صاحب کے مصاحبین اور اعزہ کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ یکایک ایک زنانہ طائفہ اور ایک مردانہ طائفہ فرشی سلام کرتا ہوا آ موجود ہوا۔ محفل موسیقی شروع ہو گئی۔ میں تو طعمہ کمرے میں چلا آیا۔ تقریباً ۲ بجے رات تک تاک دھنا دھن کی صدائیں آتی رہیں۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔۔۔ اس دھما چوکڑی میں کون سو سکتا تھا اور سب سے زیادہ نیند اڑنے والی بات میرا کل کا معاملہ تھا حکیم بدھن دو بجے میرے پاس آ کر برابر پلنگ پر لیٹ گئے اور بولے۔

یار تم عجیب نسوڑے ہو، ایک منٹ کو بھی محفل میں نہ بیٹھے کس غضب کا ناچ اور گانا ہوا ہے۔ مزہ آ گیا۔

میں نے کہا۔

اوّل تو مجھے موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دوسرے یہ کل والی بات مجھے

اتنا کہہ کر حکیم صاحب تو سو گئے۔ ان کے خراٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں لوگ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آجاتی ہے۔ لیکن جناب مجھے تو پلنگ کے اوپر بھی نیند نہ آئی۔ میں جاگتا رہا۔ رات بھر اس تنہا کمرے میں اس جن زدہ لڑکی کے ساتھ رہنے کا مسئلہ مجھے کھائے جا رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ حکیم صاحب نے سارے جوڑ توڑ ملا کر معاملہ آسان کر دیا تھا۔ لیکن اگر ایک فیصدی بھی حقیقت ہوئی تو میرا کیا حشر ہوگا۔ میری اختلاجی کیفیت نے مجھے ادھ موا کر رکھا تھا۔ خیر صبح ہو گئی۔ میرے لئے چائے اور ناشتہ آ گیا۔ حکیم صاحب محو خواب تھے تو چودھری صاحب بھی آرام فرما رہے تھے۔ میں چائے کے بعد وقت گزارنے پر مجبور رہا تھا خدا خدا کر کے ۱۱ بجے حکیم صاحب بھی بیدار ہو کر باہر تشریف لائے۔ ناشتہ ہوا اور اب اندرون خانہ چلنے کی تیاری ہوئی۔ حکیم بڈھن نے مجھے الگ لیجا کر کہا۔

یار یہ تمہارا عجیب حال ہے تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ تمہارے چہرے پر وحشت کے آثار ہیں۔ آخر تم اتنے بزدل کیوں بنتے جا رہے ہو۔ میاں اپنے کو سنبھالو معاملہ کچھ بھی نہیں ہے۔

معاملہ کچھ تھا یا نہیں میری پریشانی انتہا کو تھی۔ چودھری صاحب آگے آگے ان کے پیچھے میں اور میرے برابر حکیم بڈھن۔ ایک بڑے دروازے سے زنان خانے میں داخل ہوئے۔ اندر بہت بڑا صحن پار کر کے ایک کمرے میں پہونچے۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ ایک جانب ایک کرسی پڑی ہوئی تھی جس میں تیل کھول رہا تھا اور ایک جانب سینی میں پسی ہوئی مرچیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں صرف پلنگ پڑا ہوا تھا جس پر مجھے بادل ناخواستہ بیٹھنا پڑا۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی مجھے

حیرت ہوئی کہ میری اختلاجی کیفیت۔ اور گھبراہٹ ایک دم سے غائب ہو گئی حکیم صاحب اور چودہری صاحب مجھے چھوڑ کر باہر چلے آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور ایک جانب سے ایک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی ریشمی غرارے اور دوپٹے میں آہستہ آہستہ میری جانب بڑھی۔ اس نے اپنا منہ گھونگھٹ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ پہلے تو آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ پھر یکایک بڑھی اور میرے قدموں پر گر کر رونے لگی۔

میں نے کہا۔

تم مجھے صاف صاف بتا دو مجھے معلوم ہے کہ تم نے ڈھونگ رچا رکھا ہے تم اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ شادی سے بچنا چاہتی ہو۔

اس نے گلوگیر آواز کے ساتھ کہا۔

آپ سچ کہتے ہیں یہی بات ہے۔ وہ شخص شرابی ہے، جواری ہے اور آوارہ ہے۔ ابا جان زبردستی بھائی کی محبت میں مجھے قربان کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔

تم کس سے نکاح کرنا چاہتی ہو؟

اس نے کہا۔

اپنے ماموں زاد بھائی نور محمد کے ساتھ ——— وہ لوگ غریب ہیں۔ یہی ان کا عیب ہے جس کی وجہ سے میری ماں کی بات بھی میرے والد نے ٹال دی۔

میں نے کہا۔

اچھی بات ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور جیسا میں کہوں

ویسا ہی کرنا۔

اس نے میری جانب نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔

شاہ صاحب آپ اس کو قبول کر لیں نہیں تو مجھے ملال ہو گا۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ میری آنکھوں میں مرچیں نہ جھونک دیں اور مجھے کڑھاؤ میں نہ جھونک دیں۔

میں نے کہا۔

اگر تم اگلے خاملوں والی ترکیبیں کرتیں تو واقعی یہی حشر ہوتا لیکن تم نے انسانیت برتی تو مجھے تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ ٹھہرو۔ جیسا میں سوال کروں ویسا ہی جواب دینا۔

میں نے مردانے دروازے پر دستک دی۔ چودھری صاحب نے دروازہ کھولا میں نے کہا۔

اندر آجائیے۔

وہ آگئے۔ اب میں نے کہا۔

آپ سن لیں۔ یہ جنات صاحب ایک شرط پر آپ کی صاحبزادی پر سے جانے کو تیار ہیں۔ جو میں آپ کو باہر بتاؤں گا۔ میں نے بمشکل ان کو راضی کیا ہے۔ آپ باہر چلیں صاحبزادی کو اندر بھیج دیں۔ یہ اب بالکل ہوش میں ہیں۔ چودھری صاحب نے لڑکی کو اندرون خانہ پہونچانے کے بعد مجھے ساتھ لیا اور باہر حویلی میں آگئے۔

میں نے حکیم بدھن کو سارا حال بتادیا حکیم بدھن بولے۔

یار مجھے استاد مانتے ہو کہ نہیں۔!

میں نے کہا۔

ہاں بھائی ـــ لیکن میں نے جو ذہنی تکلیف اُٹھائی ہے اسکی بھی حد نہیں ہے۔

اب حکیم صاحب چودھری صاحب سے بولے۔

جناب چودھری صاحب! شاہ صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ یہ جنّات صاحب جو آپ کی صاحبزادی کے اوپر ہیں بہت اچھے قسم کے ہیں اور پیدائش کے وقت سے ان کا سایہ بچی کے اُوپر ہے۔

چودھری صاحب نے کہا۔

آپ صحیح فرماتے ہیں۔ بچی بچپنے میں اکثر چونکا کرتی تھی۔

حکیم صاحب نے کہا۔

چودھری صاحب آپ بُرا تو نہیں مانیں گے۔

وہ بولے۔

نہیں ـــ فرمایئے۔

حکیم صاحب نے کہا۔

آپ جس بھتیجے کے ساتھ لڑکی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ معاف فرمایئے گا۔ آوارہ، بدچلن، جواری اور شرابی ہے۔

چودھری صاحب جھجکتے ہوئے بولے۔

جی نہیں ـــ آپ سے کسی نے غلط بات کہی ہے۔

وہ بولے۔

جی کسی نے نہیں، جنّات صاحب نے شاہ صاحب سے کہی ہے۔ ممکن ہے

جنّات صاحب جھوٹے ہوں۔

چودھری صاحب نے کہا۔

جی! اصل بات یہ ہے کہ ابھی بچہ ہے۔ آگے چل کر سنبھل جائے گا۔

حکیم صاحب بولے۔

یہ بات تو آپ جنّات صاحب سے کہیے۔ وہ قطعی تیار نہیں ہیں کہ لڑکی کی شادی آپ کے بھتیجے کے ساتھ ہو ورنہ وہ لڑکی کی جان نہیں چھوڑیں گے۔ اسی شرط کا ذکر شاہ صاحب نے آپ سے کیا تھا۔ ان کو گفتگو کرنے کا ملکہ نہیں لہٰذا میں ان کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ اور یہی نہیں لڑکی کی شادی بھی فوراً ہونا ضروری ہے ورنہ جن صاحب نہیں مانیں گے۔ وہ تو کہیے شاہ صاحب تگڑے عامل ہیں جو جن صاحب نے دب کر گفتگو کر لی ورنہ آپ دیکھتے جو حشر ہوتا۔

چودھری صاحب نے کہا۔

ابھی تک تو میرے ذہن میں کوئی اور لڑکا نہیں ہے۔

حکیم صاحب نے کہا۔

یہ نورو میاں کون ہیں۔

چودھری صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

حکیم صاحب یہ نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

حکیم صاحب نے کہا۔

وہی جنّات صاحب نے بتایا ہے۔

چودھری صاحب نے کہا۔

یہ میرے سالے کا لڑکا ہے۔ نیک ہے شریف ہے اور تعلیم یافتہ ہے۔

حکیم صاحب نے کہا

اور غریب کیسا ہے۔

وہ بولے۔

غریب آدمی ہے۔

حکیم صاحب نے کہا۔

غربت تو عیب نہیں ہے۔ چودھری صاحب میری مانئے میں اگر آپ نور میاں

کا انتخاب کر لیں تو کیسا رہے۔

وہ بولے۔

قبلہ حکیم صاحب برابر کا جوڑ نہیں ہے۔

حکیم صاحب بولے۔

تو پھر آپ چودھرائن صاحبہ کو کیسے لے آئے۔ وہ بھی تو اسی گھر کی لڑکی ہیں۔

چودھری صاحب لاجواب ہو گئے۔ بولے

میری ایک ہی لڑکی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے

حکیم صاحب نے کہا۔

چودھری صاحب معاف فرمائیے گا۔ اس کا انتظام آپ خود بھی کر سکتے ہیں

جنات صاحب کی بھی مرضی ہے جو میں بتانے دے رہا ہوں۔ اگر آپ نے کہیں

اور کا ارادہ کیا تو صاحبزادی کی جان پھنسی رہے گی۔

چودھری صاحب نے کہا۔

بہت اچھا، میں شام تک سوچ لوں۔ شام کو پھر تواضع کا اہتمام ہوا۔
رات کے لئے پھر انھوں کو احہ کام چلے گئے۔ محفل سے قبل چودھری صاحب نے کہا۔
میں نے اپنے گھر میں رائے لے لی ہے۔ ٹھیک ہے میں نور میاں کیساتھ
لڑکی کی نسبت کر دوں گا۔ رات بھر دھما چوکڑی رہی۔ میں تو شریک نہیں ہوا۔
دوسرے دن سہ پہر کے وقت چودھری صاحب ہم دونوں کو چھوڑنے
کے لئے خود اسٹیشن تک آئے چھٹی تو نہ ملتی۔ حکیم بدھن پر چودھری صاحب عاشق
ہو گئے تھے۔ لیکن میری وجہ سے رخصت مل گئی۔ گاڑی میں بٹھانے کے بعد
چودھری صاحب نے کچھ حکیم صاحب کو بند سا ہوا پیش کیا۔ گاڑی چھوٹنے کے
بعد حکیم صاحب نے مجھے دو سو روپے کے نوٹ دیتے ہوئے کہا ـــ بھائی یہ
تم کو نذرانہ ملا ہے ـــ میں نے وہ بھی غنیمت ہی سمجھا مجھے جو لڑکی نے سو روپے
نوٹ دیئے تھے وہ میں حکیم صاحب سے چھپا گیا تھا۔

شاعر فیکٹری

۲

اب سے چھبیس برس پہلے کی بات ہے۔ میرا قدیم وطن لکھنؤ۔ کبوتروں کا شہر، وضعداروں کا شہر، آن بان کا شہر، تہذیب کا شہر، اخلاق کا شہر، صلاحیتوں کا شہر، عالموں کا شہر اور شاعروں کا شہر تھا (اب کا حال معلوم نہیں) شاعری کا عالم یہ تھا کہ آپ کو عموماً شہر میں ہر شخص شاعر ہی ملتا۔ کوئی نام ایسا نہ تھا جس کے ساتھ تخلص لگا ہوا نہ ہو۔ اچھا دور تھا۔ مشاعروں کی وہ بہتات تھی کہ خدا کی پناہ کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں ہر ہفتے کی شب ایک مشاعرہ نہ ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ شہر میں متعدد ادبی انجمنیں تھیں جن کے ماہانہ طرحی مشاعرے واقعی دیکھنے کے لائق ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں بیضاوی نشست ہوتی تھی۔ شعرا کے سامنے شعرا بیٹھتے تھے۔ سامعین شعرا کی پشت پر بیٹھا کرتے تھے۔ ہر شاعر کے سامنے پانچ پانچ پان ایک مٹی کی چھوٹی سی ہانڈی میں رکھ دیے جاتے تھے۔ یہ ہانڈیاں بھی خاص قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ سرخ طول کے کپڑوں سے منڈھی ہوئی اور منہ والی پر سنہری لچکا ٹنکا ہوا۔ ہر چار شاعر صاحبان کے درمیان ایک حقہ ہوا کرتا تھا کیا مجال

تھی کہ آج کل کی طرح شعرا صاحبان خاموش اور ساکت بیٹھے رہیں۔ وہ ہر غزل خوانی کے وقت داد دینے پر مجبور تھے۔ اگر کسی شعر میں کوئی صنعت یا کوئی خاص ترکیب ہوتی۔ اس پر شعرا صاحبان کی کامل نظر داد کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ شاعر کا دل بڑھ جایا کرتا تھا۔ آج کل تو شاعر صاحبان خود شاعر کی تنقید کرتے ہیں۔ داد تو دور کی شے ہے۔ ہائے وہ دور۔ اس زمانے میں شہر کے ہر استاد کا گھر شاعر فیکٹری ہوا کرتا تھا۔ روزانہ شام کو ان کے گھروں پر مجمع رہا کرتا تھا جن کی غزلوں پر اصلاح کا سلسلہ نصف شب تک جاری رہتا تھا۔ ان فیکٹریوں کے علاوہ ایک اہم خاص پرائیویٹ فیکٹری بھی تھی۔ اور وہ تھی حکیم بدھن کی فیکٹری جو نواب بیا صاحب کے چائے خانے میں قائم تھی۔ وہاں کا واحد کاریگر یہ حقیر فقیر بہزاد لکھنوی تھا۔ اس فیکٹری کا کاروبار کیسا چلتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مجھے روزانہ دو روپے میرے اجر دوری کے مل جاتے تھے۔ اختلاجی کیفیت کے سبب ریلوے کی ملازمت چھوٹ چکی تھی۔ حکیم بدھن نے مجھے اپنے پاس راز داری کی ہزار ہا قسمیں کھلوانے کے بعد رکھ لیا تھا۔ ابتدا ہوئی تھی ایک روپیہ یومیہ سے۔ لیکن ترقی ہوتی رہی۔ اس وقت میں دو روپے کا کاریگر تھا۔ میری ڈیوٹی کے اوقات بھی عجیب تھے۔ صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی مجھے چائے خانے پہنچنا ہوتا تھا جہاں ایک بڑا غلیظ گڈھ کا بسکٹ اور چھوٹی گوٹی مکھن کی ٹکی ہوئی اور ایک پیالی چائے بطور ناشتہ فیکٹری کی طرف سے مل جایا کرتی تھی۔ میرے ناشتے کے دوران حکیم بدھن مسکراتے ہوئے داخل ہوتے تھے۔

کلین شیو، جامہ زانی انگرکھا، دوپلڑی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ پمپ، عطر میں بسے ہوئے۔ مسکراتے ہوئے۔ کون حکیم بدھن، شاعر فیکٹری کے

مینیجنگ پروپرائٹر ـــــ داخل ہوتے ہی پوچھتے۔

"بہزاد صاحب کو ٹھیک ناشتہ پہنچا کہ نہیں نواب صاحب"

نواب بیّا صاحب جواب دیتے۔

"اجی ان کا تو پورا چائے خانہ ہی ہے جو جی چاہے مانگ لیں"

اس جواب کو سن کر وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ مجھے مصرعِ طرح دیدیتے اور چلے جاتے۔ میری بنیس نکل آتی اور شعر ہونا شروع ہو جاتے۔ اب حکیم صاحب کے پاس ان کے گاہک آنا شروع ہوتے۔ کچھ نبض کی ٹپ لیتے کچھ نسخے کا نمبر معلوم کرتے اور کچھ حضرات گھریلو مسائل کے سلسلے میں رائے لیتے اور کچھ شعراء۔ حضرات حکیم صاحب باری باری ان حضرات کی میزوں پر جاتے۔ ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ چائے چلتی رہتی۔ حکیم بدھن کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس سے ہر شخص صد در صد مطمئن ہو جاتا تھا حکیم صاحب کو اس سے کیا انتفاع تھا۔ یہ مجھے باوجود کوشش بسیار نہ معلوم ہو سکا۔ دوسرے مجھے اپنے دو روپے روز سے کام تھا اور بس۔ جو مجھے رات کے نو بجے مل جایا کرتے تھے۔ اور میں گھر چلا آیا کرتا تھا۔ حکیم صاحب خدا جانے کب تک چائے خانے میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ تھا روزانہ کا معمول! اس کارخانے میں ایک چھوٹی سی میز میرے لئے مخصوص تھی جس کے پاس صرف دو کرسیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک پر میں بیٹھا رہتا تھا اور دوسری خالی رہتی تھی۔ سوائے حکیم بدھن کے کسی کو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اور یہ میز اور کرسی دونوں چائے خانے کے کنارے والے گوشے میں لگی رہتی تھیں۔ میرے پاس خواہ کام ہو یا نہ ہو حکیم صاحب دو روپے روز میرے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ میری گاڑی بڑے سکون و

آرام سے چل رہی تھی۔ بڑا مستانہ انداز تھا۔ ایک دن حکیم صاحب کے پاس ایک موٹے تازے قسم کے ادھیڑ عمر کے آدمی آئے جن سے حکیم صاحب بہت تپاک سے ملے اور ان کو لئے ہوئے سیدھے میری میز پر آ گئے۔ ایک فالتو کرسی منگائی گئی جس پر وہ صاحب تشریف فرما ہو گئے۔ حکیم صاحب نے ایک بڑا آرڈر ان کی تواضع کے لئے بہ آواز بلند دیا اور بولے

"یار جنا صاحب خیریت تو ہے تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو"

وہ بولے — کیا بتاؤں بھائی بڈھن۔ میں آج پانچ برس کے بعد وطن آسکا ہوں۔ مجھ سے نہ پوچھو یہاں کے در و دیوار دیکھ کر مجھ پر کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ مجھے قسمت سے ایک ایسا رئیس مل گیا ہے جو مجھے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں کرتا ہے۔ مجھے بڑا آرام ہے لیکن کوفت ہے تو صرف ایک — ہائے لکھنؤ وائے لکھنؤ —"

حکیم بڈھن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یار بات تو یہ ہے کہیں چلے جائیے۔ لکھنؤ سے دل لگتا ہی نہیں ہے۔ لکھنؤ کی صحبتیں، لکھنؤ کے شب و روز یاد آتے ہی رہتے ہیں — اور کہو رئیس کا رنگ کیا ہے —؟

جنا صاحب بولے۔ بھائی بڈھن کیا بتاؤں وہ شخص تو اتنی ہیرا ہے ہیرا۔ بہت بڑا تعلقدار ہے۔ یار لوگوں نے اسے خوب بیوقوف بنا رکھا ہے دولت لٹ رہی ہے۔ آج کل وہ شاعری پر لٹو ہو رہا ہے تو وہ بھی شاعر بنا بیٹھا تخلص لکھا ہے۔ مجبورؔ بہت بد آواز ہے لیکن اپنے کو تان سین سے کم نہیں سمجھتا

روزانہ شب میں شعر خوانی بارہ ایک بجے رات تک ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد محفل عیش گرم ہوتی ہے صبح تک۔ دن بھر سوتا ہے۔ سہ پہر کو آٹھ گھنٹے دن کا کھانا کھاتا ہے۔"

حکیم بدھن نے گھبرا کر پوچھا۔

اور رات کا؟

جنا صاحب بولے۔ رات کا کھانا رات کے چار بجے ہوتا ہے۔ اماں ہاں یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں ایک مصیبت میں تمہارے پاس آیا ہوں۔

بولو اس کا کیا علاج ہے؟

حکیم بدھن نے گھبرا کر کہا۔

خیریت۔ خیریت۔"

وہ بولے۔ "بھائی بدھن خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ جو کام میں لے کر آیا ہوں وہ طلسم ہوشربا کی فتح سے کم نہیں ہے۔"

ہائیں۔ یہ حکیم بدھن نے کہا۔ کیا ایسی مشکل ہے میرے لائق جو خدمت ہو میں دل و جان سے حاضر ہوں۔"

وہ بولے۔ بھائی بتاتا ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ میری نوکری کا دارومدار اسی پر ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ آج صبح اسٹیشن سے اتر کر گھر جانے کا گنہگار ضرور ہوں۔ سامان رکھ کر سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ گھر والے روکا کئے لیکن میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

"بیٹھو بیٹھو۔ یار جنا۔ تم ذرا سی بات میں گھبرا جایا کرتے ہو۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

اب پورا واقعہ سناؤ۔ پہیلیاں بجھانے سے کیا فائدہ؟

وہ بولے۔ بھائی بدھن میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ان رئیس صاحب کو شاعری کا خبط ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں نے ان کو شاعر تو بنا دیا ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہے تو ٹا پھوٹا میں بھی کہہ لیتا ہوں۔ ان کا سارا کلام میرا ہی مرہون منت ہے۔ لیکن ابھی پرسوں کا ذکر ہے کہ ان کے ایک دوست جو خود بھی زمیندار ہیں آ گئے۔ انہوں نے کھانے کے دوران کہا کہ ایک مشاعرہ ہو جانے تو کیسا ہے؟

حکیم بدھن نے خوش ہو کر کہا۔

پھر کیا جواب دیا۔ ان رئیس صاحب نے۔

کیا جواب دیا۔ جناب صاحب بولے۔ اماں وہاں تو ذرا سے اشارے کی دیر تھی، چلئے جناب آنے والا ہفتہ طے ہو گیا۔

تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے حکیم بدھن نے کہا، پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے وہ بولے۔ اجی ان صاحب نے یہاں کے چار نوجوان شعراء کا نام لے دیا حکیم بدھن نے پوچھا۔ کون کون شعرا کے نام ہیں۔ چلو میں مدعو کئے دیتا ہوں اور تم جانتے ہو حکیم بدھن کی بات ٹلتی نہیں ہے۔

وہ بولے۔ سنو جناب.... جناب.... جناب....

حکیم بدھن نے کہا۔۔۔ اماں یہ چاروں تو شہر کی ناک ہیں۔ یہ تو سوائے بہت بڑے مشاعروں کے باہر جاتے ہی نہیں ہیں اور اب کی ہفتے تو ہمارا ادب کا سالانہ

مشاعرہ ہے۔ یہ اس شہر کی محفل چھوڑ کر ہزار روپے پر بھی باہر نہیں جائیں گے۔"

جناب صاحب نے کہا۔ یہی تو مشکل ہے۔ میرے نام بھی دعوت نامہ دہیں پہنچ گیا تھا مجھے معلوم تھا لیکن رئیس تو سنتا ہی نہیں ہے۔ جب میں نے انجمن کے سالانہ مشاعرے کا ذکر کیا تو بولے۔ جناب صاحب پھر تمہاری ملازمت سے کیا فائدہ ہے۔ جب تم اپنے شہر کے شاعر بھی نہیں لا سکتے تو کس مصرف کے ہو۔ چاہے دو ہزار روپے صرف ہو جائیں۔ یہ چاروں شاعر یہاں شرکت کریں گے میرے مشاعرے میں۔ تم فوراً جاؤ اور ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر لاپچ دلا کر لے آؤ۔ اب تم ہی بتاؤ یہ لوگ کیونکر جائیں گے اور نہ جائیں گے تو میری ملازمت ختم سمجھو۔ ان رئیس صاحب نے اپنے دوست کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہہ دیا ہے یہ چاروں میرے مشاعرے میں ضرور آئیں گے۔ اب بتاؤ بھائی بڈھن ان چاروں کو لے کر کیوں کر جاؤں۔

تمریا بٹ، بالک ہٹ، راج ہٹ مشہور ہے

حکیم بڈھن کے چہرے پر غور و تفکر کے آثار رونما ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

بھائی جناب تم چائے پیو اور ناشتہ کرو اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو۔

زیادہ دیر نہیں دس منٹ۔ حکیم صاحب خاموش سوچتے رہے۔ جناب صاحب اور میں ناشتے میں شریک رہے۔ پورے دس منٹ کے بعد حکیم بڈھن کے چہرے پر بشاشت کے آثار پیدا ہوئے اور وہ بولے۔

ایک سوال کروں ہم کیا ان رئیس کے دوست صاحب نے ان شاعروں کو دیکھا ہے یا ملاقات ہوئی ہے۔

نہیں۔ پورے وثوق کے ساتھ اس لئے کہ ہمارے رئیس صاحب سے

کہہ رہے تھے کریں تو بھی ان چاروں شاعروں کی تعریف سنی ہے دیکھا نہیں ہے۔

حکیم بڈھن اچانک اچھل پڑے اور بولے۔

تو پالا مار لیا یار جنا۔ یہ چاروں چلیں گے اور ڈنکے کی چوٹ چلیں گے لیکن بھائی پیسا بلا دریغ خرچ ہوگا۔

جنا صاحب بولے۔ یہ کیونکر چلیں گے۔ کیا فیس یا نذرانہ قبول کر لیں گے۔

حکیم بولے۔۔ یار توبہ کرو۔ کہیں شاعر فیس یا نذرانہ لیتے ہیں (اس زمانے میں نذرانہ یا فیس سخت معیوب سمجھا جاتا تھا)

جنا بولے۔۔ پھر۔ حکیم نے کہا۔

یار میں چار خوش گلو چھوٹے موٹے شاعر ابھی بلوائے لیتا ہوں۔ ان کے تخلص وہی رکھے دیتا ہوں جن کے لئے تم کو بھیجا گیا ہے۔ ان کی غزلیں بھائی بہزاد تیار کر دیں گے۔ ان چاروں کی مشہور غزلوں پر دوسری غزلیں کہی جائیں گی۔ ابھی ایک ہفتہ ہے۔ اور یہ چاروں چلیں گے ان شاعروں کی بجائے۔

جنا بولے۔ اور اگر یہ راز کھل گیا۔

حکیم بڈھن بولے۔ کیونکر کھلے گا۔ آخر ان چاروں کو وہاں کے کسی شخص نے دیکھا نہیں ہے۔ دوسرے تخلص کوئی رجسٹرڈ چیز نہیں ہے کہ دوسرا نہ رکھ سکے۔ اسے بھائی تم مدتوں کے بعد آئے ہو اس تخلص کے جو صاحبان تم کہتے تم نے مدعو کر لیا۔ چاروں بھی ہوتی تمہارا قصور گیا ہے اور تم یقین مانو میرے ذہن میں جو چاروں آدمی آئے ہیں بڑے خوش گلو ہیں۔ خود بھی اچھا کہتے ہیں لیکن مقدر کی بات ہے کہ مشہور نہ ہو سکے۔

جناؔ صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اور اگر پھر بھی راز کھل گیا تو؟

حکیم صاحب نے کہا۔ یار تم تو بڑے تھڑدلے ہو۔ ارے بھائی نوکری تو یوں بھی جا رہی ہے یہ یوں بھی جائے گی۔

جناؔ صاحب کے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے اور بولے۔ یار کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔ تم تیاری کرلو گے۔ میں تار دیدوں کہ شاعروں کو بک کرلیا۔ وہاں بڑی بے چینی ہوگی۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ قطعی دیدو لیکن اخراجات کے لئے مجھے تھوڑی بہت رقم دے جاؤ۔

جناؔ صاحب کی جیب سے ایک پلندا دس دس کے نوٹوں کا نکلا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی رقم ہوگی۔ وہ حکیم صاحب کی جیب میں چلا گیا۔

یہ ہفتہ بڑا ہنگامی گزرا۔ وہ چاروں شاعر بلائے گئے۔ ان کے نئے تخلص رکھے گئے۔ میں چاروں صاحبان کو بخوبی جانتا تھا۔ اچھا ترنم تھا۔ لیکن محض مبتدی قسم کے شاعر تھے۔ لہٰذا شہر میں چل نہیں سکتے تھے۔ ان کے لئے سوٹ کیس خریدے گئے۔ ان کے کپڑے درست کئے گئے۔ میرے ذمے ان حضرات کے لئے نو نو اشعار کی دس دس غزلیں تیار کرنا تھیں۔ میں چونکہ کاریگر تھا اور فیکٹری کا مال اسپیشل قسم تھا لہٰذا مجھے حکیم صاحب گھڑی گھڑی آکر ہدایات دے رہے تھے۔ دس غزلیں یومیہ تیار ہونا تھیں۔ چار دن میں ان شعرائے کرام کو غزلیں دیدینا تھیں تاکہ یہ باقاعدہ ریہرسل کریں۔ کہیں اٹکیں نہیں۔ مکمل رازداری کی شرط اور

غالباً کچھ نذرانے بھی حکیم صاحب نے ان سے طے کر لئے۔ مجھے فیکٹری کی طرف سے اس خاص مال کی تیاری پر دو سو، دو ہرے پتوں کی شکل یا پیشگی اور ایک پتا بخیریت واپسی کی شرط پر ملنا تھا۔ آپ یقین جانیں۔ میں نے مدتوں کے بعد سو سو کے نوٹ دیکھے تھے۔ میں دل و جان سے محنت کر رہا تھا۔

حکیم صاحب نے اپنے سالے صاحب کو میری غزلیں خوشخط لکھنے کے لئے مامور فرما دیا تھا۔ خدا خدا کرکے غزلیں تمام ہوئیں۔ جیسے کا دن تیاریوں میں صرف ہوا۔ مجھ فقیر کے لئے بھی دو جوڑے کپڑے تیار کر لئے گئے۔ اس لئے کہ میرا دعوت نامہ بھی شاعر کی حیثیت سے جناب صاحب نے بھجوا دیا تھا۔ خیر یہ تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل میں جناب صاحب اور حکیم صاحب کی طرف سے آن ڈیوٹی جا رہا تھا کہ اگر وہاں کوئی ضرورت پڑ جائے تو ان شعراء صاحبان کو ذلت نصیب نہ ہو اور حکیم صاحب نگراں کی حیثیت سے چھپا رہے تھے۔ آخر کار ہفتے کا دن آ ہی گیا۔ حکیم صاحب کا سوٹ کیس اور بستر مع پاندان کے جائے خانے میں دوپہر ہی سے وارد ہو گیا۔ میرے دونوں جوڑے بھی حکیم صاحب نے اسی سوٹ کیس ہی میں رکھ لئے۔ گاڑی رات کے آٹھ بجے چھوٹتی تھی۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ چاروں شاعر صاحبان بھی اپنے اپنے سوٹ کیس اور بستروں کے ساتھ تشریف لے آئے۔ حکیم صاحب نے تانگے بلوائے اور یہ شاعروں کا قافلہ آغا میر کی ڈیوڑھی چھوٹی لائن کے سٹی اسٹیشن روانہ ہوا۔ چونکہ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لئے گئے۔ غالباً ان چار شاعر صاحبان کے لئے یہ پہلا موقع سیکنڈ کلاس میں سفر کا تھا۔ وہ حیرت سے سکینڈ کلاس کی آرام دہ گدیاں اور ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑی چھوٹنے کے بعد

تاشوں کی گڈی نکل آئی۔ اور ہونے لگا کوٹ پیس۔

میں چونکہ کاریگر تھا لہٰذا تنہا چھوڑ دیا گیا۔ خدا بھلا کرے شاعری کا چل پڑی۔ ادھر گاڑی چھکا چھک چل رہی تھی، اور ادھر میری شاعری، تقریباً بارہ بجے یہ محفل تاش ختم ہوئی۔ شعرائے کرام اور حکیم بڈھن لیٹ رہے۔ گاڑی صبح آٹھ بجے منزل مقصود پر پہنچاتی تھی صبح چھ بجے سب لوگ بیدار ہو گئے اور جب میں نے ایک جنکشن اسٹیشن سے سب کے لئے ناشتے منگائے تو شعراء صاحبان حیرت میں رہ گئے۔ غالباً زندگی میں پہلی بار ان صاحبان نے ٹرین میں اس قسم کا ناشتہ کیا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی منزل مقصود پر پہنچی۔ اسٹیشن پر جنا صاحب اور پانچ چھ آدمی سواری لئے موجود تھے۔ ہم لوگوں کے اترتے ہی جنا صاحب دوڑ کر ایک ایک سے بغلگیر ہوئے۔

اور پوچھا۔ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ حضرات کو۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ یار بڑے آرام سے سوتے ہوئے آئے۔

حکیم بڈھن نے جنا صاحب سے ایک شاعر کا اس کے نام کے ساتھ تعارف کرایا۔ جنا نے چپکے سے کہا۔ بھائی بڈھن میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔

وہ بولے۔ یار کیوں پریشان ہوتے ہو۔ کہو مشاعرے کی تیاری کا کیا حال ہے۔؟

وہ بولے۔ ایک بڑا پنڈال لگے گا۔ بڑا اہتمام ہے۔ اور شعراء صرف آس پاس کے قصبات سے آرہے ہیں۔

باہر موٹریں موجود تھیں۔ ایک موٹر پر شعراء صاحبان اور جنا صاحب بیٹھے۔ دوسری پر میں اور حکیم صاحب اور وہ لوگ جو پیشوائی کو آئے تھے۔ موٹر روانہ ہوئی۔

بات تو ٹھیک ہی ہے لیکن اس راز کو تم ہی خوب سمجھ سکتے ہو۔ میاں بہزاد یہ چودھری صاحب نرے کودن ہیں خیر سے موسیقی میں بھی دخل ہے۔ میں نے جو راگ راگنیاں سنا دیں تو لٹو ہو گئے۔ کل گانے بجانے کی محفل ہو گی طائفے اور گویوں کو احکام جا چکے ہیں۔

کیا سمجھے ۔۔۔ میں نے کہا۔

یار میری مرن ہو گئی مجھے تمہاری اس یکی موسیقی سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔

وہ بولے تم آرام سے سونا یا شعر کہنا اور ہاں آج تو خیر تمہاری چھٹی ہے۔ کل تم کو اپنا کام کرنا ہے۔ یار دو روپے کی مزدوری کیوں چھوڑ دو۔

میں خاموش ہو گیا۔ رات بھر چونکہ بیدار رہا تھا۔ لہٰذا سو رہا۔ پانچ بجے شام کو پھر چائے آئی۔ حکیم بدھن صاحب اب چودھری صاحب سے تم تم کر کے باتیں کر رہے تھے۔ خود جنا حیران تھا کہ یہ کیا جادو حکیم نے کر دیا۔ رات کے کھانے پر بھی اتنی مرغن اور اتنی زائد اقسام تھیں کہ میں تو گھبرا گیا۔ ٹھیک ۸ بجے جنا شعرائے کرام کو لیکر مشاعرہ گاہ چلے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ حکیم بدھن غائب تھے۔ میں نے پوچھا۔ جنا صاحب حکیم صاحب کہاں ہیں؟ جنا بولے۔

ان کو چھوڑیئے بہزاد صاحب وہ تو ہاتھ سے گئے۔ آپ لوگ چلئے میں خاموش ہو رہا۔ مشاعرہ گاہ کا پنڈال گیس بتیوں سے منور ہو رہا تھا۔ تمام کا تمام اعلیٰ قالینوں کا فرش تھا۔ درمیان میں ایک ڈائس بنا ہوا تھا جس پر ایک زر کار مسند اور دو زر کار گاؤ تکیے رکھے تھے۔ دو صفوں میں آمنے سامنے شعرائے کرام بیٹھ گئے۔ اور بالکل سامنے کے رخ پر سامعین۔ سامعین کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اتنے میں

چودھری صاحب کی آمد کا غل ہوا۔ وہ برآمد ہوئے۔ ایک بے حد قیمتی شیروانی اور صافے میں ملبوس حکیم بڈھن کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ حکیم بڈھن بھی اپنے جامدانی کے انگرکھے میں سج رہے تھے۔ حاضرین ممدوح تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے۔ دونوں صاحبان برابر مسند پر جلوہ گر ہو گئے۔ جناب صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اب مشاعرے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک شاعر کو آواز دی۔ غریب جھینپتے ہوئے ڈائس پر آئے۔ غزل پڑھی۔ غزل اچھی تھی۔ اچھی داد ملی۔ یکے بعد دیگرے شعرائے کرام آتے رہے اور پڑھ کر جاتے رہے۔ غزلیں اچھی اچھی ہو رہی تھی۔ داد بھی کافی مل رہی تھی۔ لیکن جس شعر پر حکیم بڈھن داد دیتے تھے۔ اس پر چودھری صاحب بہت زور دار داد دیا کرتے تھے۔ اور چودھری صاحب کی داد پر سامعین بے انتہا داد دیتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ شاعر کی کامیابی یا ناکامی اس مشاعرے میں حکیم بڈھن کے ہاتھ تھی واہ رے حکیم بڈھن۔

تقریباً ۳ بجے رات کو میرا نمبر آیا۔ خدا جانے کیا تھا۔ میں پڑھتے وقت مدہوش سا ہو گیا۔ داد کا ایک طوفان تھا جو چہار جانب سے اُٹھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے مقطع پڑھا اور ڈائس سے اُترنے والا تھا کہ چودھری صاحب نے جیب سے دو گنیاں نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

بہزاد صاحب تم نے کمال کر دیا۔ میری غزل سب سے آخر میں تم ہی پڑھنا

میں نے کہا بہت اچھا۔

اور ڈائس سے اُتر آیا۔ میرے بعد لکھنؤ کے معروف ترین مصنوعی شاعر کا نمبر تھا۔ میرے بعد والے صاحب تو بالکل مارے گئے۔ میرا رنگ جما ہوا تھا۔

چودھری صاحب نے کہا۔۔۔۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہ حضرات (شعرائے کرام) کی طرف دیکھ کر) اجی یہ نہیں کہتا۔

حکیم بڈھن نے قہقہہ مار کر جملہ پورا کیا۔ وہ شعرائے کرام نہیں ہیں جن کو آپ مدعو کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔ یہی بات ہے نا استاد۔

چودھری صاحب نے گردن ہلا کر کہا۔

ہاں یہی بات ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیونکر ہو سکتی ہے۔ جبنا میرے نمک حلال ملازم ہیں۔ پھر تم ان کے ہمراہ آئے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے دیکھا جبنا کا چہرہ اترا ہوا تھا اور میرے ساتھیوں کا بھی۔

حکیم صاحب نے اب کی ایک اور لمبا قہقہہ مارا اور کہا۔

بھائی چودھری تم کیا سارا ہندوستان اسی چکر میں ہے۔ بھیا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ یہ حضرات بہت مشہور ہیں اور بیحد پسند کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا لکھنؤ کے چار حاسدوں نے انہی کے تخلص رکھ لئے۔ اب تخلص کوئی رجسٹرڈ چیز تو ہے نہیں اور عام طور پر بلکہ شاعروں کو ان کے تخلص ہی سے جانتی ہے نام تو تخلص کے بعد اس طرح مٹ جاتا ہے کہ جیسے کبھی رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ یہ چاروں حضرات چونکہ اپنے فن پر مغرور ہیں۔ ہر مشاعرہ کیا سوائے بڑے مشاعروں کے کہیں جاتے ہی نہیں ہیں اور وہ بھی صاحب مشاعرہ کے بیحد اصرار پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرات ہر مشاعرے میں شرکت کرنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ جس سننے والے نے ان کو سنا ہے وہ ان کو نقلی سمجھے گا۔ ان حضرات کو اس کی پرواہ نہیں ہے بھلا ان کا سا فن۔ ان کی سی زبان۔ ان کی سی روانی وہ

کہاں سے لائیں گے۔ لہذا ان صاحب نے قسم کھا کر تم سے کہا کہ یہ حضرات وہ نہیں ہیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے قطعی سچ کہا ہے۔ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ یہ وہ نہیں ہیں، وہ نہیں ہیں، وہ نہیں ہیں اور خدا نہ کرے ویسے ہوں۔

چودھری صاحب یقین مجسم بنے ہوئے سن رہے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

بھیا چودھری۔ جنّاتو انہیں کے پاس جانے والے تھے اور پھنس جاتے اگر میں نہ ہوتا۔ جب انہیں نے مجھ سے کہا تو میں نے کہا خدا کے لئے ان کے جال میں نہ پھنسنا وہ تو اصل کی نقل ہیں۔ تب جناّ چونکے۔ میں اور جناّ فوراً ان حضرات کے ہاں پہنچے کیا کیا خوشامدیں ان لوگوں نے نہ کرائی ہیں۔ ہر بار انکار۔ لیکن بھائی میں حکیم بڈھن ہوں۔ آخر راضی ہی کر کے چھوڑا اور لے کر آ ہی گیا۔

چودھری صاحب نے کہا۔ بیشک یہی بات ہے۔ میں حیرت میں تھا کہ ایسا نمک حلال اور وفادار ملازم بھلا کیوں کر مجھے دھوکا دے سکتا ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ تم بھی ساتھ آئے ہو نا ممکن، کہنے والے نے اپنی دانست میں صحیح بات کہی تھی۔ چلو اچھا ہوا میں نے تم سے پوچھ لیا ورنہ میرے دل میں خلش رہ جاتی۔ اور ہاں بھائی بڈھن رات کو تم کو کچھ سرفراز کرنا ہو گا۔

حکیم ہنسے اور بولے۔

ہم تو بھائی یاروں کے یار ہیں جیسی مرضی ہو تمہاری۔

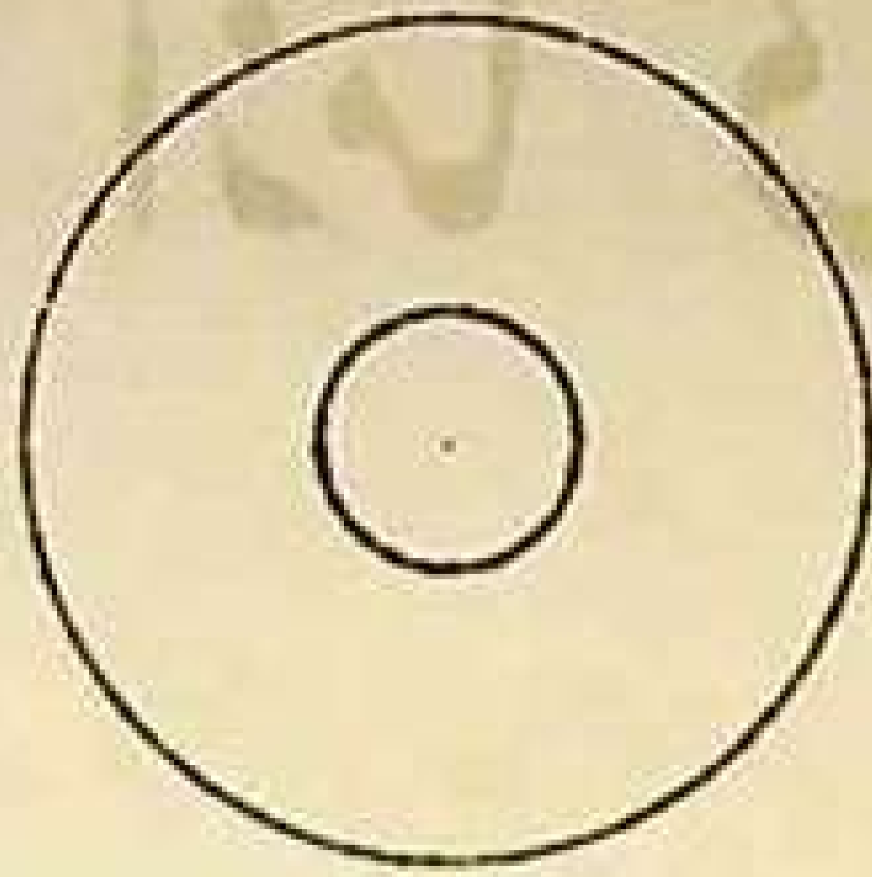
رات بھر دھما چوکڑی رہی۔ گاتے بجاتے واہ، واہ اور سبحا اللہ کے

نعرے لگتے رہے۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہا۔ شعرائے کرام بھی گانے بجانے کے شوقین تھے۔ میں برابر سوچ رہا تھا کہ واہ رے حکیم بدھن کمال کر دیا نقل کو اصل کر دکھایا اور کیوں نہ کرتا یہ اس کی فیکٹری کا مال تھا بھلا اس میں اتنا بڑا عیب کیوں کر رہ سکتا تھا۔



آزمائشی مشاعرہ

۳



کہنے کو یہ ایک دو لفظی نام ہے لیکن اس کی خطرناکی خدا کی پناہ۔ ایٹم بم سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ جہاں وقوع پذیر ہوتا ہے وہاں شاعر کی عمر بھر کی کمائی ہوئی شہرت اور وقار چشم زدن میں خاک میں ملا دیتا ہے۔ یہ ایک سچی آپ بیتی اس لئے آپ کی خدمت میں پیش ہے کہ آپ اس وقتی مشاعرے سے بچاؤ کی تدبیر معلوم کر لیں اور یہ بھی ہے کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

اب سے ۲۵ برس پہلے کا لکھنؤ فن و ادب کا گہوارہ تھا۔ اساتذہ میں جناب آرزو، جناب صفی، جناب عزیز، جناب محشر، جناب حکیم منے آغا صاحب فاضل، آفتاب، جناب بندہ کاظم جاوید، جناب انجمن صاحب ذاکر، جناب ابو صاحب عالم، جناب دانش، جناب عبد الباری صاحب آسی اور جناب مولانا انقر موہانی انتہائی مشہور تھے۔ ان کے گھروں پر صبح سے شام تک شاگردوں کا جم غفیر اصلاح سخن کیلئے جمع رہتا تھا اور کیوں نہ رہتا اس لئے ہفتے کی کوئی

شب ایسی نہ تھی جس میں محلے دار دو چار طرحی مشاعرے نہ ہوتے ہوں اور کوئی مہینا ایسا نہ جاتا تھا جس میں کسی ادبی انجمن کا کوئی بڑا مشاعرہ نہ ہوتا ہو۔ اس ماحول میں حکیم بدھن کی شاعر فیکٹری کا کام چلنا حکیم بدھن کے کمال پر مبنی تھا۔ تقریباً جتنے شعرا تھے وہ اساتذہ کے پابند تھے۔ لیکن واہ رے حکیم بدھن وہ ہر روز دو چار نئے گاہک پیدا کر ہی لیتا تھا۔ اور کیوں نہ کرتا آخر تھا بھی فیکٹری کا مینیجنگ پروپرائٹر۔ مجھے حیرت یہ ہوتی تھی کہ بعض اوقات ایسے حضرات حکیم صاحب کے پاس متواتر آتے تھے جن کو شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن حکیم سے تھوڑی دیر گفتگو کر کے وہ ایک عدد تخلص اور ایک غزل لیکر واپس جاتے تھے۔ اس فیکٹری کی صحیح آمدنی کیا تھی مجھے باوجود کوشش بسیار نہ معلوم ہو سکا۔ مجھے میری محنت کے دو روپے روز رات کے دس بجے گھر جاتے وقت مل جایا کرتے تھے۔ اور میرے واسطے بس یہی کافی تھا۔

ایک دن میں حیرت سے اچھل پڑا جب میں نے بانکے مہتاب علی کو چائے خانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیدھے حکیم بدھن کے پاس چلے گئے اور بیٹھ گئے۔ بانکے مہتاب علی پشتینی بانکے تھے۔ ان کے والد نواب انجد علی شاہ کے دور میں مشہور بانکے تھے۔ ان کے والد واجد علی شاہی دور کے اور مہتاب علی اس دور کے واحد بانکے تھے۔ ان کا سن تقریباً پچاس سال کا ہوگا بھاری بھرکم خوبصورت نقوش کے مالک تھے۔ داڑھی منڈی ہوئی لیکن مونچھیں انتہائی خوفناک جو ہمہ وقت آسمان کی طرف اٹھی رہتی تھیں۔ جاڑا ہو گرمی، برسات ہو ریشمی پھولدار شیروانی پہنے رہتے تھے۔ ہر یہ شیروانی کے کپڑے کی

پھولدار دو پلی ٹوپی جس کے چاروں طرف سنہری بیل ٹکی ہوتی تھی۔ پیروں میں چوڑی دار پاجامہ جس کے ساتھ یہ دو رنگا جوتا پہنتے تھے۔ یہی ان کا بانکپن تھا کبھی ایک پیر میں سفید اور دوسرے میں کالا جوتا اور کبھی ایک پیر میں سنہری اور دوسرے میں روپہلی۔ شہر میں کسی دوسرے کی مجال نہ تھی کہ یہ وضع اختیار کرے یا بانکے صاحب کو دیکھ مسکرا سکے۔ میں نے کبھی ان کی شورہ پشتی کا کوئی واقعہ نہیں سنا اور نہ کہیں مشہور تھا۔ لیکن ان کے رعب کا یہ حال تھا کہ شہر کے تمام غنڈے ان کو دیکھ کر کترا جایا کرتے تھے۔ بانکے مہتاب علی کا یہی رعب شرفائے شہر پر بھی تھا۔ یہ اکثر گھریلو جھگڑوں میں بلائے جاتے تھے اور یہ جس فریق کے ساتھ ہوتے تھے اس کا کام بن جاتا تھا۔ ان میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ یہ ناحق کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ شادی بیاہ کے جھگڑوں میں بانکے صاحب ہمیشہ ممد و معاون ثابت ہوتے تھے اور غالباً یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ پولیس میں بھی ان کی اچھی آؤ بھگت تھی اور عزت بھی۔ اس لئے کہ پولیس جن مراحل میں ناکام رہتی وہاں بانکے مہتاب علی کی موجودگی جرائم کا حل آسانی سے کر دیتی تھی۔ ان کی گرجدار آواز اور ان کا رعب و داب شہر کے نوجوانوں پر بھی خاصا تھا۔ اس لئے کہ اگر بازار میں انہوں نے کسی نوجوان کو گھومتا ہوا دیکھ لیا تو وہیں سے ڈانٹ کر کہتے۔

"کیوں جی! تمہارا بازار میں کیا کام۔ سودا منگانا تھا تو ملازم کو بھیج دیا ہوتا سیدھے گھر جاؤ اور اگر میں نے تم کو بازار میں دیکھ لیا تو بغیر تمہارے والد سے پوچھے ہوئے تمہارا مزاج درست کر دوں گا۔

یہ تھا مہتاب بانکے مہتاب علی کا جغرافیہ۔ ان کو حکیم بڈھن کے پاس

دیکھ بیحد مسرت ہوئی۔ تادیر حکیم بڈھن سے گفتگو میں مشغول رہے۔ چائے، پیسٹری اور بسکٹوں کا دور چلتا رہا۔ انہیں کے خوانِ نعمت سے کبھی میرے لئے بھی ایک حصہ آگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بانکے صاحب چلے گئے۔ حکیم بڈھن منجرِ از شان سے میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور بولے۔

پرسوں منصور نگر کی چڑھائی پر ایک مشاعرہ ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولے۔

"وہاں کی طرح غالب گلستاں میں، بیاباں میں ہے"

میں نے کہا۔ میرے پاس بھی دعوت نامہ آیا ہے۔

وہ بولے "اس زمین میں تم کو نمبر ۱ شعر کہنا ہیں۔ لیکن مضامین گاہک کی مرضی کے ہوں گے"

میں نے کہا۔ "کہو"

وہ بولے "مثلاً مطلع میں یہ مضمون ہونا چاہیے کہ تم محسن ہو گو رغریباں میں فاتحہ پڑھنے مت جاؤ۔ ڈر جاؤ گے۔ اشعار میں یہ مضامین ضروری ہیں۔ حسد کو دیکھ کر مسکراتے ہو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہو اور میرے دل پر اتنے پتھر مار و کہ وہ چھلنی ہو جائے اور مرنے کے بعد بھی میری قبر سے یہ صدا آئے گی کہ تمہاری جفائے محبوب کا شکار ہوں ......"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بھائی حکیم صاحب یہ تمام مضامین تو ایک غزل میں آنے سے رہے۔ بہر نوع میں کوشش کروں گا۔

وہ بولے۔ "استاد آج ہی تو پھنسے ہو۔ اب تک تو تم جو چاہتے تھے لکھ کر دیدیا کرتے تھے۔ یہ گاہک تگڑا ہے پیسے دے گا۔ ہاں اپنی مرضی کا خریدنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "یار بدھن یہ تم نے پتھر میں جونک کیسے لگالی۔؟

حکیم بدھن قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

ذرا میری پیٹھ ٹھونک دو۔ بھلا بانکے مہتاب علی کو شاعری سے کیا سروکار لیکن اتفاق دیکھو، وہ کوتوال صاحب کے سالے ہیں نا سہیل۔ ان کو اپنے بہنوئی کے کوتوال ہونے پر غرہ ہے۔ اور وہ ہمارے بانکے صاحب کو خاطر میں نہیں لاتے بانکے صاحب کو یہ بات ناگوار ہے۔ وہ کسی صورت سے سہیل کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں لہٰذا میں نے یہ تان دیا کہ تم مشاعرے میں سہیل کو شکست دیدو۔ تب اسکی نگاہ نیچی ہوگی۔ چلئے جناب کام یوں بنا اور فیکٹری ایک عدد گاہک مل گیا۔ پرسوں تم غزل نہیں پڑھو گے۔ میں اور تم دونوں مشاعرے میں بانکے صاحب کا دل بڑھانے چلیں گے۔

میں نے کہا۔ تو چاہے خلنے میں سے دس پانچ آدمی، اور کیوں نہ لے لئے جائیں۔

بولے "ہاں یہ ترکیب اور چوکھی رہے گی۔"

منصور نگر کی چڑھائی پر محلے کا ماہانہ مشاعرہ تھا۔ محمود نگر، نخاس اور چوک کے خاصے مشہور شاعر موجود تھے۔ میں اور حکیم بدھن مشاعرہ شروع ہونے سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے دس منٹ پیشتر بانکے مہتاب علی

مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے۔ وہ زمانہ حلقے کی نشست کا تھا۔ وہ حلقے میں بیٹھ گئے

مشاعرہ ٹھیک وقت پر شروع ہوا۔ شعرا کی غزلوں نے سماں باندھ دیا۔ سننے والے بھی صاحب ذوق تھے۔ دل کھول کر داد دیتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ سہیل کی باری آئی۔ سہیل نے پڑھنا شروع کیا۔ غزل حاوی تھی چلی۔ بانکے مہتاب علی کا نمبر سہیل کے بعد چوتھا تھا۔ جب شمع محفل بانکے صاحب کے سامنے آئی انہوں نے پہلے اپنے گلے کے بٹن کھولے۔ آستینیں چڑھائیں، کھنکار کر گلا صاف کیا اور گرجدار آواز سے کہا۔

مطلع عرض کرتا ہوں جو صاحبان جہاں تشریف فرما ہیں ذرا غور و خوض سے سماعت فرمائیں۔ مطلع عرض ہے۔

بغیر ترنم کے بانکے صاحب نے مطلع پڑھا۔ کچھ ان کا رعب، کچھ ان کا طریقہ ادائیگی مشاعرے کو بھا گیا۔ بے پناہ داد کا شور بلند ہوا۔ بانکے صاحب نے کھڑے ہو کر حاضرین کو سلام کرنا شروع کیا۔ مکرر مکرر کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لیکن میری زبان خاموش تھی۔ میں حیرت سے بانکے مہتاب علی کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک حکیم بدھن نے کہا۔

”یار بہزاد تم داد کیوں نہیں دیتے؟“

میں نے کہا مجھے بے حد حیرت اس بات پر ہے کہ بانکے مہتاب علی کے ہاتھ میں جو غزل کا ٹکڑا ہے وہ دو انچ سے زائد لمبا نہیں ہے اور ایک انچ سے زائد چوڑا نہیں ہے۔ یہ بغیر عینک کے کیونکر اتنی مہین لکھائی پڑھ رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے کہا۔ یہ بھی ان کا بانکپن ہے۔ ان کے بیٹے ضرور کچھ

نواب ہیں۔ خفی لکھنے میں شہر بھر میں فرد ہیں۔ وہی اتنے چھوٹے سے کاغذ پر ان کو لکھ کر دیتے ہیں۔ اور یہ اپنی بینائی کا مظاہرہ اس طرح سے کرتے رہتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ یہ کوئی خاص سرمہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور وہ سرمہ فروخت بھی کرتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ بانکے صاحب اشعار پڑھتے رہے اور انکو بے پناہ داد ملتی رہی۔ میری نظر اتفاقاً بہیں کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ فق تھا اور اس پر ناگواری کے اثرات تھے۔ بانکے مہتاب علی کی غزل کے بعد اوس شعراء پر اوس پڑ گئی صرف استادوں کی غزلیں کچھ چلیں اور یوں محفل مشاعرہ برخواست ہوئی۔

دوسرے دن بانکے مہتاب علی مٹھائی کا ٹوکرا لئے ہوئے چلے خانے میں داخل ہوئے اور بڑھ کر حکیم بدھن سے لپٹ گئے۔ تا دیر باتیں ہوتی رہیں ان کے جانے کے بعد مجھے چار غزلوں کی تیاری کا آرڈر ملا۔ جن کے مضامین خود بانکے صاحب کے تجویز کردہ تھے۔ میں ہر اتوار کو یہ خبر سن لیا کرتا تھا کہ بانکے صاحب کی غزل بہیں سے بازی لے گئی اور تھوڑی بہت خوشی مجھ کو بھی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ غزلیں حکیم بدھن کی فیکٹری کی مصنوعات میں سے ہوتی تھیں لیکن مجھے اس کا یقین تھا کہ سامعین یہ داد بانکے صاحب کی روینس کھا کر دیتے تھے۔ دن گزر رہے تھے۔ ایک دن بانکے صاحب گھبرائے ہوئے حکیم بدھن کے پاس آئے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد حکیم بدھن نے مجھ سے کہا۔

"یار بہزاد کچھ خبر لگی ہے یہ بانکے صاحب کیوں گھبرائے ہوئے آئے تھے؟"
میں نے کہا "تم جانو۔"

وہ بولے — "بانکے صاحب کو بہیں نے ایک خط لکھا ہے کہ میں پرسوں چند احباب کے ساتھ سہ پہر کے وقت آپ کے گھر آؤں گا۔ اگر مناسب سمجھئے تو تھوڑی دیر مشقِ سخن ہو جائے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ بانکے صاحب نے کیا جواب دیا۔

حکیم بڈھن نے کہا "بانکے کیا جواب دیتے سوائے اس کے کہ تشریف لائیے۔ چنانچہ وہ لوگ پرسوں چار بجے شام کو بانکے صاحب کے وہاں آ رہے ہیں —"

میں نے کہا یہ تو غضب ہو گیا۔ وہ اگر مصرع طرح نکالیں گے اور بانکے صاحب جتنے پانی میں ہیں وہ ظاہر ہے۔ تم نے کیا ترکیب نکالی ہے؟"

حکیم بولا۔ یار تم گھبراتے ہو۔ انشاء اللہ فتح اپنی ہی ہو گی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم تین بجے بانکے صاحب کے مکان پہنچ لو اور چھپ کر دالان کے ملحقہ کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ مجھے کیا عذر تھا۔ کاریگر جو ٹھہرا۔

پرسوں تین بجے میں بانکے صاحب کی حویلی پہنچا۔ ان کے صاحبزادے حضوری نواب نے مجھے لے جا کر ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا۔ ساڑھے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ حکیم بڈھن دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ آئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں بہیں دس بارہ شاگردوں کیساتھ

آ گئے۔ آداب عرض، تسلیمات عرض کی آوازیں بلند ہوئیں۔ بانکے مہتاب علی تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ چائے اور فواکہات پیش ہوئے۔ چائے کے بعد سہیل نے کہا۔

جناب بانکے صاحب ہم لوگ اس وقت مشق سخن کے لئے آپ کے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کوئی مصرع تجویز ہو جائے ''

بانکے مہتاب علی نے بڑی بے پراہی سے جواب دیا۔

بہت مناسب خیال ہے۔ میری رائے میں تو ایک صاحب بحر تجویز کر دیں، ایک صاحب قافیہ مقرر فرما دیں۔ ایک صاحب ردیف اور ایک صاحب مصرع موزوں فرما دیں اور وقت مقرر ہو جائے کہ کتنی دیر مشق سخن کی اجازت ہو گی ''

میں بانکے مہتاب علی کی اس جسارت پر حیران تھا کہ اس شخص نے خود مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ سہیل نے بھی حیرت سے بانکے مہتاب علی کو دیکھا شعرا میں سے ایک صاحب نے بحر تجویز کی۔ ایک نے قافیہ اور ایک نے ردیف اور ایک نے مصرع موزوں کر لیا۔ حکیم بدھن نے آدھ گھنٹے کا وقت تجویز کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ آدھ گھنٹے کے بعد پنسل اور کاغذ سامنے رکھ دینا ہو گا۔ دوران شعر خوانی شعر لکھنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ چلئے جناب پنسلیں اور چھوٹے چھوٹے سے کاغذ شعرا کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ گردنیں ہلنے لگیں۔ بانچھیں چلنے لگے۔ ہلکی ہلکی گنگناہٹ فضا میں سنائی دینے لگی۔ میں نے کمرے میں دس منٹ سات شعر کہے اور حضوری کو دیدیے۔ حضوری نواب نے

دوا پانچ بجے چوڑے کاغذ پر جلد جلد وہ ساتوں شعر لکھے اور نوکر کے حوالے کئے میں حیرت میں تھا کہ یہ کاغذ بانکے صاحب کو کیوں کر پہنچے گا۔ نوکر نے اس کاغذ پر تھوڑی سی شکر رکھنے کے بعد ایک پڑیا بنائی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی لیکر مشاعرہ گاہ میں پہنچا۔ اور اس نے کہا۔

"حضور کی دوا کا وقت ہے۔ حضور دوا نوش فرمالیں۔

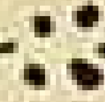
بانکے اٹھے نوکر کے پاس آکر وہ پڑیا کھولی۔ شکر منہ میں پھانک لی۔ پانی پی لیا اور کاغذ ہاتھ میں دبائے ہوئے مشاعرہ گاہ میں بیٹھ گئے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے کے بعد پنسلیں رکھ دی گئیں۔ اور شعر خوانی شروع ہوئی۔ تقریباً دس بارہ شاعر شریک مشاعرہ تھے مجھے حیرت تھی کہ کسی نے تین چار شعروں سے زیادہ نظم نہیں کئے تھے۔ بعض اشعار پھس پھسے بھی تھے سہیل نے پانچ شعر سنائے۔ شعر واقعی اچھے تھے آخر میں صاحب خانہ مہتاب علی صاحب نے وہی کاغذ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ واقعی غزل اچھی تھی۔ حکیم بڈھن جن لوگوں کو لے کر گئے تھے انہوں نے چھتیں پھاڑ دیں۔ ایک صاحب نے پھولوں کا ہار بڑھ کر بانکے صاحب کے گلے میں ڈال دیا میں نے دیکھا کہ سہیل انتہائی حیرانی میں بیٹھا ہوا ہے۔

دوسرے دن بانکے مہتاب علی حکیم بڈھن کے لئے کچھ کپڑوں کا پارسل لائے اور حکیم سے بولے۔

"بھائی بڈھن یہ تمہاری نذر ہے۔ واقعی تم نے جو ترکیب نکالی تھی

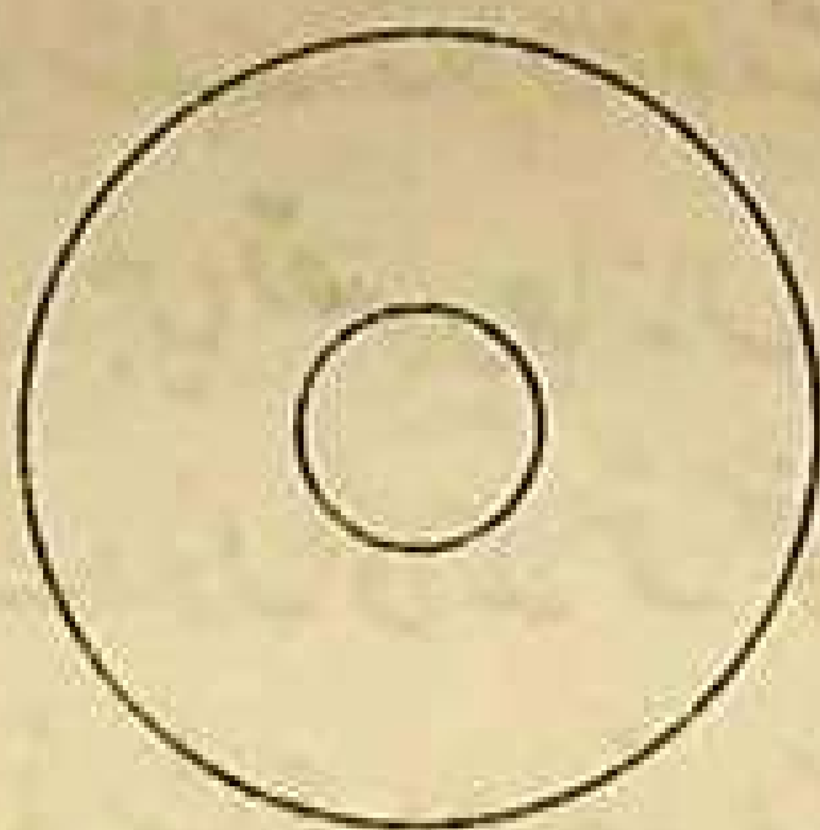
اس کا جواب نہیں۔

(اگر کبھی واقعی مشاعرے میں پھنسنے کا موقع آجائے تو یہ آزمودہ ترکیب ہے اس کو ذہن نشین رکھیے۔)



ریل گاڑی میں جنّات

۳



حکیم بڈھن شاعر تو نہیں تھے مگر شاعر گر ضرور تھے۔ شہر کا کوئی تک بند کوئی چھٹ بھیا، کوئی نوخیز طالب علم ایسا نہیں تھا جو حکیم بڈھن کی فیکٹری کا خریدار نہ ہو۔ اس لئے کہ اور فیکٹریاں سب ختم ہو چکی تھیں۔ صرف حکیم بڈھن کی فیکٹری پوری تندہی سے مصنوعات کی تیاری میں مصروف تھی۔ محلوں کے ہفتہ وار مشاعرے اس فیکٹری کی آمدنی میں دن رات اضافہ کر رہے تھے لیکن میں زندگی کی یکسانیت سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

تو جناب عمر تمام ہو رہی تھی۔ صبح ۶ بجے چائے خانے کی حاضری، پنسل کاغذ اور غزل گوئی۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد چائے کی ایک مفت پیالی نے چائے کے نام سے متنفر کر دیا تھا۔ میری رگوں میں بجائے خون کے چائے گردش کرنے لگی تھی۔ حکیم بڈھن کے قہقہے، ان کا خریداروں کا استقبال، آرڈروں کی وصولی

اور سپلائی۔ یہ سب تمام دن دیکھا کرتا تھا غالب کا دل تو چاہتا تھا یہ

پھر چاہتا ہے دل وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

تو جناب مجھے فرصت کے دنوں کی تلاش تھی تو ضرور لیکن دوسرے انداز میں اور وہ انداز تھا "بیرونی مشاعرہ" اللہ اللہ عجب باکرامت اور پر اعجاز چیز ہے۔ بیرونی مشاعرے کا دعوت نامہ ملتے ہی رگوں میں خون کی روانی بے حد تیز ہو جاتی ہے۔ فوراً لباس کی دیکھ بھال شروع ہوتی ہے۔ واشنگ کمپنی کی طرف قدم بڑھ جاتے ہیں۔ پھر سوٹ کیس اور ہولڈال کی فکر ہوتی ہے جن کے بغیر شاعر کی عظمت مکمل نہیں ہوتی۔ ان فروعات کے بعد غزل کا نمبر آتا ہے مصرعہ طرح پر غزل (وہ دور طرحی غزلوں کا دور تھا) گوئی۔ ایک ایک شعر پہ ناقدانہ نگاہ پھر احباب کا مشورہ، غزل کی اتنی منجھائی کہ نگاہ ٹھہرنا مشکل ہو جائے پھر منی آرڈر کا انتظار، پھر تاریخ کا انتظار، پھر روانگی۔ پرائے پیسے پر مفت ریل کے سفر کا لطف۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد استقبال کا منظر پر کیف جائے قیام پر تواضع اور مدارات سے استفادہ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پلاؤ زردہ، پراٹھے، کھیر، قورمہ مرغ اور کباب پہ اٹھتے۔ رات میں ہاتھوں ہاتھ مشاعرہ گاہ میں شرف ارزانی۔ ہر نظر کا خود پر پڑنا۔ پھر اناؤنسر کا کئی جھوٹی سچی تعریفوں کے بعد ہمارے نام کی پکار۔ پھر ہمارا پڑھنا۔ کچھ واقعی اور کچھ بہ خیال میزبانی سامعین کی تعریف، غرض ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر وطن واپس ہونا۔

یہاں ایک صاحب سے مشاعرے کے حالات بیان کرنا یہ کیا کم

کیف سامانیاں ہیں کہ تصورِ جاناں کی فکر ہو۔ تو جناب اس تمہید کے بعد عرض کرنا ہے کہ یہ خاکسار بیرونی مشاعرے کے دعوت نامے کے لئے پریشان تھا۔ اس زندگی کی یکسانیت کے بعد وہی گھما گھمی مزہ دے سکتی تھی۔ لیکن خدا جانے باہر کے مشاعرے والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا تھا۔ کئی ماہ سے کہیں کا کوئی دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ میں حکیم بڈھن سے بھی کہہ چکا تھا اسی کوفت میں کاغذ پنسل لئے ہوئے بیٹھا تھا کہ حکیم بڈھن ہنستے ہوئے چائے خانے میں داخل ہوئے اور مجھ سے بولے۔

"کیا کر رہے ہو بہزاد؟"

میں نے کہا۔ "اجی وہی روز روز کی گھس گھس ہے۔ اور کیا ہے۔"

وہ بولے۔ "اچھا ادھر آؤ۔ تمہارا دل خوش کر دوں۔"

میں بادلِ ناخواستہ اٹھا اور ان کی میز پر پہنچا۔ انہوں نے ایک خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس کو بغور پڑھو اور مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔"

میں نے خط کو دیکھا۔ خط کا کاغذ بہت قیمتی تھا۔ اس پر ابھرے ہوئے نیلے حروف میں ایک ریاست کا نام چھپا ہوا تھا اور ایک جانب "راج بھون" لکھا ہوا تھا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ خط کچھ یوں تھا۔

"بھیا حکیم بڈھن! نمستے۔ شاید تم اپنے راجن کو بھول گئے ہو گے۔ لیکن میں ایک لمحہ بھی تم کو، تمہارے قہقہوں اور تمہاری باتوں کو نہیں بھول سکا۔ پتا جی کے سورگباش ہو جانے کے بعد ریاست کی دیکھ بھال میرے سر آ پڑی

معاملات بہت خراب تھے۔ سات برس کی تگ و دو کے بعد بھگوان کی کرپا سے ریاست کے معاملات صاف ہو گئے۔ ان سات برسوں میں تم تو تم میں خود کو بھی بھولا ہوا تھا۔ جس کی خواہ مخواہ تم سے معافی چاہتا ہوں۔ ذرا قہقہہ تو لگاؤ ہاں بھیا ضرورت تحریر یہ ہے کہ اس ماہ کی اٹھائیس تاریخ کو میری سالگرہ ہے میں تو چاہتا تھا کہ خاموشی سے سالگرہ منا لوں۔ لیکن میری رعیت نہیں مانتی۔ لہٰذا ناچ گانے اور آتشبازی کے علاوہ ایک مشاعرہ بھی ہونا قرار پایا ہے۔ ہمارے منیجر صاحب خود بھی شاعر ہیں جنہوں نے بھاگلپور سے دو، چھپرہ سے تین اور گورکھپور سے چار شاعروں کو دعوت نامے بھیج دیئے ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء کا ذمہ میں نے لے لیا ہے اور وہ بھی تمہاری وجہ سے۔ لہٰذا بھیا چھٹا چھٹ آٹھ بہترین شاعر اور ایک استاد کو لے کر تم ۲۵ تک ضرور پہنچ جاؤ۔ ۲۵ کو دربار ہے ۲۶ کو مردانہ گانے کی محفل، ۲۷ کو زنانی گانے کی محفل اور ۲۸ کو مشاعرہ، اور شعراء بھی ۲۵ تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن ایک بات راز کی بتا دوں جتنے شاعر آرہے ہیں سب بلبلیں ہیں بلبلیں۔ منیجر صاحب کہتے ہیں کہ ان سب کی خوش آوازی اور ترنم بلا کا ہے۔ تم بھی سات عدد قمریاں لے کر آجاؤ۔ اخراجات کی فکر نہ کرو۔ ایسے ویسے شاعروں کو نہ لانا ورنہ میری سبکی ہو جائے گی۔ اور ہاں ایک عدد ہارمونیم اور ایک طبلے کی جوڑی خریدتے لانا۔ میرا ہارمونیم اور طبلہ پرانا ہو چکا ہے اور میرے گانے بجانے کا نقصان ہو رہا ہے۔ مبلغ آٹھ سو روپے کا منی آرڈر کر رہا ہوں۔ بے فکر ہو کر ۲۵ کو صبح آٹھ بجے کی گاڑی پر تمہارے استقبال کیلئے لوگ موجود ہوں گے۔

(تمہارا راجن)

میرے خط کے ختم کرتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"کہو استاد — آخر بیرونی مشاعرہ آگیا کہ نہیں مرے جا رہے تھے بیرونی مشاعرہ بیرونی مشاعرہ"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ قمریاں کہاں سے لاؤ گے اور ایک ہما کی بھی فرمائش ہے وہ کہاں سے ملے گا۔ ۲۸ ربیع کو انجمن بہار ادب کا سالانہ مشاعرہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ کس اہتمام سے اور کیسا ہوتا ہے اور کوئی اچھا شاعر تو تمہارے ہاتھ لگے گا نہیں اور نہ ہی کوئی استاد"

حکیم بدھن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ جو قمریاں فیکٹری میں ہیں یہ"

میں نے کہا "یہ تو سب کے سب چرکوے ہیں قمری تو ایک بھی نہیں"

وہ بولے! اجی نہیں چرکوؤں کو اگر قمری نہ بنایا تو حکیم بدھن نہ کہنا"

میں نے کہا۔ چلو دل تو نہیں مانتا لیکن مان لیا۔ اور ہما کہاں سے لاؤ گے؟"

وہ بولے — "اجی یہ تو سب سے آسان کام ہے۔ نواب کلن صاحب کو لے لوں گا۔ یہ سفید سفید بڑی بڑی مونچھیں اور پٹے، کیا رعب نہ جما سکیں گے رہا کلام تو مہربانی کر کے آج ہی سے انجیریں سانپ اور تقدیریں سانپ جیسی سنگلاخ زمینیں نکال کر پانچ غزلیں تیار کرلو۔ چلو چھٹی ہوئی اور ہاں مہربانی کر کے ان آٹھ سو روپے کی آ [illegible] سے ذکر نہ کرنا"

میں نے وعدہ کرلیا۔ [illegible] نا منی آرڈر بھی آدھمکا۔ حکیم بدھن نے

مجھے سو روپے کا ایک نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"سات شاعروں کے لئے چار چار غزلیں چلتی ہوئی زمینوں میں بہترین اور استاد کے لئے پانچ غزلیں سنگلاخ زمینوں میں مجھے ۵ تاریخ تک مل جائیں آج ۵ رتاریخ ہے۔ چلو ۲۰ رتک دے دینا۔

میں خاموش رہا۔ مدتوں کے بعد سو روپے کا پتا دیکھا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دن گزرنے لگے۔ غزلیں تیار ہونے لگیں لیکن ان قمریوں کا ابھی تک دور دور تک پتا نہ تھا جن کو لے کر حکیم بڈھن اس مشاعرے میں جانے والے تھے۔ میں حکیم بڈھن سے ان راجن صاحب اور ان کی اس بے تکلفی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں بات دل ہی میں لئے رہا۔ اس لئے کہ حکیم بڈھن کی عادت تھی کہ اگر ان سے کوئی راز کی بات پوچھنا چاہو تو ٹال دیتے تھے اور اگر نہ پوچھو تو خود ہی اگل دیتے تھے اور وہی ہوا۔ مجھ سے آخری غزل وصول کرنے کے بعد بولے،

"یار بہزاد! تم سوچتے تو ہو گے کہ ایک ریاست کے مالک اور غریب حکیم بڈھن میں یہ بے تکلفی کیسی ہے"

میں نے کہا "خیال تو آیا لیکن غریب حکیم بڈھن کا نہیں بلکہ امیر الامراء حکیم بڈھن کا"

وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

"یار خوب بناتے ہو۔ ارے بھئی، راجن صاحب جن کا خط آیا ہے.... ریاست کے احباب میں افضل ہیں تو [illegible] لقب ہے۔ ان کی حیثیت

ایک بڑے تعلقہ دار کی ہے۔ لیکن ان تعلقہ داروں کا خطاب شاہی سے راجہ چلا آتا ہے۔ لہذا یہ راجا ہی کہلاتے ہیں۔ ان کا اصل نام مہابیر پرشاد ہے۔ قوم کے کائستھ ہیں۔ راجن ان کی عرفیت ہے۔ والد مرحوم ان کے والد کے علاج کے سلسلے میں مہینوں ریاست میں مقیم رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ راجن بھی بچے تھے اور میں بھی، ہم دونوں میں اسی وقت سے دوستی ہو گئی تھی اور ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب میں حسین آباد ہائی اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ یہ بھی کالون تعلقہ دار ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ یہاں لکھنؤ میں بھی تقریباً روز ان کا ساتھ رہتا تھا۔ کوئی سات برس ہو گئے جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو یہ راجا بن کر چلے گئے۔ اس وقت سے کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ یہ پہلا خط مجھے ملا ہے۔"

میں نے کہا "خیر یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارے دوست سے تمہارا سلسلہ پھر دیا لو ہو گیا۔ لیکن ان قمریوں کا کیا ہو گا۔ مشاعرے کو صرف دس دن رہ گئے اور تم کو تین دن پہلے پہنچنا ہے۔

وہ بولے "یار تم اچھی تم اختلاجی ہو۔ ادھر بھی میں نے جال لگا لیا ہے۔ آج ہی تمام قمریاں پھنس جائیں گی گھبراؤ نہیں۔ کوئی دم میں آتی ہی ہوں گی۔"

واقعی اسی گفتگو کے دس منٹ کے بعد ہی سات آدمی ایک ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اور سیدھے حکیم صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے مجھے آواز دی اور کہا۔

"بھیا بہزاد آؤ میری قمریوں سے مل لو"

میں حیران ہو کر اٹھا۔ ان میں سے میں کسی صاحب سے واقف نہیں تھا۔ صورتوں سے بھلے لوگ معلوم ہو رہے تھے اور لباس کے اعتبار سے بھی لکھنوی ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے مجھ سے گلے ملے۔ حکیم صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

بھیا بہزاد۔ یہ صاحب نشتر ہیں اور یہ صاحب جناب عابد۔ یہ حضرت روشن ہیں۔ یہ جناب ندرت، یہ جناب کیف اور یہ حضرت وفا اور یہ جناب نادر۔ یہ سب حضرات ہمارے تمہارے ساتھ مشاعرے میں چل رہے ہیں۔ سات یہ ہیں آٹھویں تم ہو۔ نواب کلن صاحب کو بھی بلا آیا ہوں۔ وہ استاد کی حیثیت سے چلیں گے۔ کہو ٹیم کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ سبحان اللہ۔

وہ بولے۔ ابھی سبحان اللہ نہ کہو۔ پہلے ان حضرات کو سن لو۔ ہاں بھئی نشتر عطا ہو۔ دو شعر۔

نشتر صاحب نے ترنم کے ساتھ دو شعر پڑھے۔ واقعی نشتر خوش آواز تھے۔ اشعار سننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ اسی فیکٹری کی تیار شدہ غزل ہے۔ اب بقیہ چھ حضرات نے بھی باری باری شعر خوانی کی۔ حقیقت میں سب کے سب خوب پڑھتے تھے لیکن غالباً سب کے سب فیکٹری کے خریدار تھے۔ جن کو شاید حکیم بڈھن مال گھر پر سپلائی کرتے تھے۔ یہاں ان میں سے آج تک کوئی نہیں آیا تھا ورنہ یہی صورت آشنا تو ضرور رہوتا۔

حکیم بڈھن نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا۔

"بھائی بہزاد! اگرچہ تم اس شہر کے رہنے والے ہو۔ لیکن ان حضرات سے ناواقف ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھائی نشتر اور کیف ڈالی گنج پار میں رہتے ہیں عابد اور رونق نخاس بتی بازار کے ہیں۔ ندرت اور وفا تمنی گنج کے اور نادر صاحب صدر کے۔ ظاہر ہے ان دور دراز محلوں میں نہ تمہارا جانا ہوتا ہے اور نہ یہ حضرات ادھر کے مشاعروں میں آتے ہیں۔ وہاں بھی ماشاءاللہ ہر ہفتے مشاعرہ ہوتا رہتا ہے۔"

یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ نواب کلن صاحب بھی گول ٹوپی اور شانی رومال اوڑھے ہوئے تشریف لے آئے۔ سب لوگ ہر وقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔

میں تو اپنی میز پر واپس چلا آیا۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بدھن فیکٹری کی تیار شدہ غزلیں ان کو دیکھ کر دستوار ہے ہیں۔

۲۴ تاریخ کی صبح ۸ بجے سفر کے لئے تیار ہو کر جب میں چائے خانے پہنچا تو میرے پاس سامان سفر میں سے صرف میری ذات کے سوا اور کچھ نہ تھا آدمی غریب ہوں اور غریب تھا۔ گاڑھے کی شیروانی، گاڑھے ہی کی ٹوپی، اور جیب میں چھالیا تمباکو کے بٹوے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ چائے خانے کے سامنے چار عدد تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ شیروانیوں اور انگرکھوں میں ملبوس شعرائے کرام تانگوں پر بیٹھنے کے منتظر تھے۔ سب کے ساتھ ایک ایک چھوٹا سوٹ کیس اور ایک ایک ہولڈال تھا۔ حکیم بدھن جامدانی کے انگرکھے اور دوپلڑی ٹوپی میں ادھر اُدھر اچک رہے تھے۔ گاڑی آٹھ بجے

چھوٹنے والی تھی۔ لہذا تمام شعرائے کرام ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ صرف میں باقی تھا۔ میں نے بھی جلدی جلدی توس کھائے۔ چائے پی اور اس تانگے پر بٹھایا گیا۔ جس پر ایک ریشمی کپڑے میں بندھا ہوا ہارمونیم اور ایک سرخ کپڑے میں بندھے ہوئے طبلے کی جوڑی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس تانگے پر بیٹھتے ہوئے ڈگ رہا تھا کہ حکیم بڈھن نے کہا۔

یار بیٹھو بیٹھو۔ میں بھی اسی پر بیٹھوں گا۔

اب مجھے مجال دم زدن نہ رہی۔ مجبوراً بیٹھ گیا۔ حکیم بڈھن بھی آکر میرے برابر بیٹھ گئے۔ تانگا چلنے کے بعد میں نے کہا۔

"یار بڈھن اس ہارمونیم اور طبلے کے ساتھ لوگ دیکھ کر قوال سمجھیں گے"

وہ بولے "قوال اور شاعر میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ شاعر اپنا حال کہتا ہے اس کو قوال کہہ لو۔ شاعر کا قول قوال گاتا ہے لہذا قوال ہو گیا۔ کہو صاحبزادے کیسی کہی ہے"

اس کے بعد حکیم بڈھن نے قہقہے پر قہقہے مارنا شروع کر دیئے۔ میں نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔

"کیا ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے لو گے۔ وہاں لوگ استقبال کے لئے موجود ہوں گے"

وہ بولے۔ اجی تم نرے شاعر ہو۔ عقل تو چھو کر نہیں گئی ہے تمہیں، میاں تھرڈ کلاس کے ٹکٹ جا کر خرید لو۔ جب ریاستی اسٹیشن پہنچنے کے لئے دو چار اسٹیشن رہ جائیں۔ وہاں سے سب کے سب ٹی ٹی سے کہہ کر سیکنڈ کے

بنوا لینا۔ آخر اتنے دن فیکٹری بند رہے گی۔ نقصان کیسے پورا ہو گا؟"

میں نے کہا "ترکیب تو عمدہ ہے لیکن تھرڈ کلاس میں بھیڑ بہت ہو گی۔ شعرائے کرام کو تکلیف کا امکان ہے"

وہ بولے۔ "بھیڑ کو چھانٹنا میرا کام ہے۔ میں ترکیب سوچ چکا ہوں ساتھ دینا تم لوگوں کا کام ہے۔ میں نے تم کو تو ترکیب بتائی نہیں ہے۔ ندرت رونق اور کیف وغیرہ کو پوری بات سمجھا دی ہے۔ تم سے یوں نہیں کہا کہ تم کو اختلاج ہو جائے گا۔ گریبان اور زور سے کھینچنا شروع کر دو گے"

اسی گفتگو میں سٹی اسٹیشن آ گیا۔ حکیم صاحب نے قلیوں کے سر پر سامان اٹھوایا۔ میں تھرڈ کلاس بکنگ آفس میں ٹکٹ خریدنے چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو شعرائے کرام کی پارٹی نمبر ۲ پلیٹ فارم کی بنچوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی آنے میں چونکہ آدھ گھنٹہ باقی تھا لہذا حکیم بڈھن نے چائے کا آرڈر دیدیا تھا۔ میرے پہنچتے ہی چائے کا دور شروع ہو گیا۔ چائے ختم ہوتے ہوتے گاڑی آنے کے لئے گھنٹہ بجا۔ گاڑی خراماں خراماں پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ تقریباً تمام ڈبے خالی تھے۔ چار باغ سے گاڑی چھوٹی تھی۔ راستے میں صرف عیش باغ پڑا تھا اور اب یہ سٹی اسٹیشن تھا۔

حکیم بڈھن نے لپک کر ایک بڑے تھرڈ کلاس ڈبے پر قبضہ کر لیا۔ یہ بالکل خالی تھا۔ سامان اوپر کی بنچوں پر رکھنے کے بعد سب کھل کر بیٹھ گئے۔

گاڑی روانہ ہوئی اور حکیم بڈھن کی لطیفہ گوئی شروع ہو گئی۔ شعرائے کرام دل کھول کر قہقہے پر قہقہے بلند کرنے لگے۔ سفر جنت محسوس ہونے لگا۔ جونہی گاڑی بارہ بنکی پہنچی

ہندوؤں کی ایک بڑی بارات کا ہجوم گاڑی پر ٹوٹ پڑا۔ جس ڈبے میں شعرائے کرام تھے ا ـــــ اس میں دولہا اور مخصوص باراتی اندر گھس آئے۔ ان کے ساتھ پکوان کے متعدد ٹوکرے بھی اسی ڈبے میں ٹھونسے گئے۔ باراتی اس تعداد میں تھے کہ دم گھٹنے لگا۔ غالباً ہر باراتی کی تمنا تھی کہ وہ دولہا کے ساتھ بیٹھے ہیں شعرائے کرام اور حکیم بڈھن سب کے سب باراتیوں کی کثرت سے پسینے لگے میں نے کہا۔

"یار بڈھن! اب تو ٹکٹ سیکنڈ کے بدلوا لو ورنہ مجھ سے سفر نہ ہوگا۔ مارے اختلاج کے میرا برا حال ہے"

حکیم بولے۔ "ٹکٹ بدلواتے ہیں گدھے۔ ابھی یہ سب باراتی ابھی بھاگ جائیں گے۔ ڈبے پر پھر اپنا قبضہ ہوگا تم ذرا صبر کرو۔ گاڑی چھوٹنے دو"

ڈبے میں چیخ و پکار کے مارے برا حال تھا۔ ایک ایک سامان کیلئے دولہا کے اعزہ چلا رہے تھے اور قریبی اعزہ کو اسی ڈبے میں گھسنے کے لئے آوازیں دے رہے تھے۔ یکایک گاڑی چھوٹی۔ میں نے دیکھا کہ حکیم بڈھن کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ان کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ لپک کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے دیوانوں کی طرح ہاتھ ہوا میں ادھر ادھر چلانا شروع کر دیئے۔ ان کے منہ سے عجیب و غریب زبان میں الفاظ نکلنا شروع ہو گئے۔ رونق، ندرت اور کیف نے جلدی سے ان کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ سارے باراتی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئے۔ یکایک ایک بوڑھے باراتی نے پوچھا۔

"بھیا جی! ان کو کیا ہو گیا ہے؟"

کیف نے کہا "لالہ جی ان پر جنات آتے ہیں۔ اس وقت وہی آگئے ہیں

آپ لوگ اس ڈبے میں ناحق آگئے۔ اگر کسی کو انہوں نے پکڑ لیا تو خواہ مخواہ آپ لوگ پریشان ہوں گے "

لالہ کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ بولا۔

" تو کیا مار پیٹ بھی کرتے ہیں "

کیف نے کہا۔ " صاحب مار پیٹ ہی نہیں۔ آپ سے آپ ہر طرف آگ پھیلا دیتے ہیں دوسروں کے سروں پر بھی آجاتے ہیں۔ آپ کے ساتھ دولہا بھی ہے۔ مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے "

اتنے میں حکیم بدھن حلقہ توڑ کر لپکے اور پکوان کے تین ٹوکروں کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ٹوکرے کھول دیئے۔ ایک میں پوریاں، ایک میں ترکاری اور ایک میں مٹھائی تھی۔ انہوں نے آرام سے کھانا شروع کر دیا۔ سارے باراتی رام رام کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ سب کے چہروں پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار تھے۔ دولہا نے بھی ڈر کے مارے سہرا الٹ دیا۔ وہی بوڑھے لالہ بولے۔

" بھیا جی ذرا ان کو سنبھالے رہیں۔ ہم اگلے اسٹیشن پر ڈبا بدل لیں گے "

کیف نے کہا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ سارے باراتی جلدی جلدی اتر کر دوسرے ڈبوں میں گھس گئے۔ غالباً برابر ہی انٹر کلاس کا ڈبا تھا۔ جس میں دولہا اور اس کے اعزا بیٹھ گئے۔ جاتے وقت ان لوگوں نے پکوان کے وہ تینوں ٹوکرے ڈبے ہی میں چھوڑ دیئے جن کو حکیم بدھن نے چھو لیا تھا۔ بھرا ہوا ڈبہ تین چار منٹ میں خالی ہو گیا۔ جب تک گاڑی نہیں چھوٹی حکیم بدھن پر جنات وارد رہے۔ گاڑی چھوٹتے ہی انہوں نے

اپنے بالوں میں کنگھی کی اور مجھ سے چپکے سے کہا۔

"کہو استاد کیسی رہی۔ ڈبے کا ڈبا خالی ہو گیا۔ اور آج دوپہر اور رات کے کھانے کے لئے بھی سامان ہاتھ آگیا۔

میں کیا کہتا۔ میں حکیم بدھن کو ایکٹر نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن وہ تو بلا کا ایکٹر نکلا۔ چہرے کی تمتماہٹ، آنکھوں کے آبالی اور وحشیانہ حرکات قطعی قدرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ کہیں بناوٹ اور تصنع کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

دوپہر کا کھانا واقعی مزہ دے گیا۔ تازہ پوریاں اور اس کے ساتھ کئی قسم کی ترکاری اور اچار، آخر میں بہترین مٹھائی۔ سب نے خوب ڈٹ ڈٹ کر کھایا۔ نواب کلن صاحب جو استاد، تجربہ کار چل رہے تھے اپنی گرجدار آواز میں بولے۔۔۔!

"بھئی حکیم صاحب ماشاءاللہ کمال کر دیا۔ مزہ آگیا۔ واللہ سفر محسوس نہیں ہو رہا۔۔

حکیم بدھن اس تعریف پر جھک کر تین تسلیمیں بجا لائے اور کہا۔

"نواب صاحب یہ سب ذرہ نوازی ہے۔ میں بجائے گھبرانے کے ذرا سی حاضر دماغی سے کام لیتا ہوں"

کھانے کے بعد حکیم بدھن نے ہارمونیم کھولا اور رونق کو دیتے ہوئے کہا۔

"! گانا بجانا بھی ہوتا چلے۔ بھیا کیف تم طبلہ لے لو۔"

چلئے جناب رونق ساز ندے۔ حکیم بدھن مغنی اور کیف طبلچی نے گاڑی میں موسیقی بکھیر دی۔ واقعی حکیم بدھن خوب گاتے تھے۔ ان کا پکا گانا میں بھی

سن چکا تھا۔ مجھے اچھے برے کی تمیز تو نہیں لیکن میں نے فنکاروں سے ان کی تعریف سنی تھی۔ حکیم نے ایک ٹھمری شروع کی۔ گھر گھر بدرا آئے ...، حکیم بڈھن واقعی بہت اچھا گا رہے تھے۔ مجھے بھی مزہ آنے لگا تھا۔ یکایک گاڑی ایک قصباتی اسٹیشن پر ٹھہری۔ اور کوئی پندرہ آدمی یکے بعد دیگرے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ سب کے آگے ایک موٹے سے ادھیڑ عمر کے ایک داڑھی مونچھ منڈے ہوئے ایک صاحب تھے جو سارے جسم سے ننگے تھے اور صرف ایک لنگوٹ کسے ہوئے تھے۔ ان کے تمام ہمراہی مشین اور قصباتی معلوم ہوتے تھے۔ سب کی داڑھیاں تھیں اور وہ سب کے سب مودبانہ انداز سے ان صاحب کے ساتھ تھے۔ ان لنگوٹ بند نے ڈبے میں گھستے ہی تین بار حق کا نعرہ بلند آواز سے لگایا اور بیٹھ گئے۔ ان کی نشست چھوڑ کر باقی تمام حضرات مودب بیٹھے۔ گاڑی چل پڑی۔ حکیم کے بدروا گھر گھر کر رہ گئے تھے پر سے نہیں تھے کہ ان میں سے ایک مشین صاحب نے کہا۔

"یہ کہاں کی قوال پارٹی ہے"

میں سمجھ رہا تھا کہ حکیم بڈھن ان کی غلط فہمی دور کر دیں گے لیکن حکیم نے کہا میاں صاحب ہم لکھنؤ کے قوال ہیں اور ایک جگہ عرس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں"

وہ بولے۔ "تو کبھی کچھ ہمارے میاں صاحب کو بھی سناؤ۔ تم انشاء اللہ ناراض نہیں ہو گے۔ لمبا سفر ہے اور ہمارے میاں صاحب کو قوالی بہت پسند ہے"

میں پھر سوچنے لگا کہ حکیم صاحب پکے گانوں کے ماہر ہیں۔ لیکن قوالی سے ان کو کیا سروکار ہے۔ انکار کر دیں گے۔ میری توقع کے خلاف وہ بولے

"بہت خوب سرکار"

یہ کہہ کر حکیم بڈھن شروع ہو گئے۔

مارا بغمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت

خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت

میں اچھل پڑا۔ حکیم بڈھن نے اس خوبی سے یہ غزل شروع کی کہ سبحان اللہ اور لطف یہ ہے کہ صابر اور نادر آ کر بازو میں بیٹھ گئے انہوں نے مصرعہ ساتھ ہی دہرانا شروع کر دیا۔ وفا۔ ندرت اور نشتر پیچھے بیٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔ قوالی کا ایک خوبصورت سماں بندھا کہ میں حیران رہ گیا۔ حکیم بڈھن نے گانے ہی کے دوران وفا سے کچھ کہا۔ وفا تالیاں چھوڑ کر میری طرف مخاطب ہوئے اور کان میں مجھے ایک بات بتائی اور دس روپے چاندی کے میرے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ اتنے میں حکیم بڈھن نے شعر گایا۔

رفتم بہ مسجدے کہ ببینم جمال دوست۔

دستش بہ رخ کشید و دعا را بہانہ ساخت

میں اٹھا اور شاہ صاحب کے سامنے اپنے ہاتھوں پر رکھ کر نذر کیا۔ شاہ صاحب نے میری صورت دیکھی۔ میری گریاں گیریاں دیکھیں اور میرے ہاتھ سے روپیہ اٹھا کر حکیم بڈھن کی طرف بڑھا دیا۔ ندرت نے اٹھ کر سلام کیا اور روپیہ لے لیا۔ خود شاہ صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نذر کے

وہ بولے۔ "یار آدمی کو چاہیئے کہ اپنے میں ہر کمال پیدا کرے۔ تم قوالی سنتے ہو کیف کے لئے، میں قوالی سنتا ہوں فنی نقطۂ نگاہ سے۔"

اب جناب ناش کی گدیاں کھل گئیں۔ کورٹ پیشی شروع ہو گیا۔ چار چار کی پارٹی مع حکیم بدھن کے بیٹھ گئی۔ اور صرف میں اور نواب کلن صاحب بے مشغلہ رہ گئے۔ میں نے نواب صاحب سے پرانے زمانے کے واقعات سننے شروع کر دیئے۔ وہ واقعی داستان گوئی کے ماہر نکلے۔ اس تعلیقے کے ساتھ شاہی واقعات بیان کرنا شروع کئے کہ میری کوفت دور ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات کے نو بج گئے۔ اب تک کوئی اسٹیشن ایسا نہیں آیا تھا جہاں کھانا مل سکے لہذا بارات کی پوریاں اور مٹھائی پھر کام میں لائی گئی۔ پیٹ بھرنے کے بعد لیٹنے کی سوجھی۔ سوائے میرے سب سو رہے۔ میں چلتی ریل میں سو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ آج تک سو سکتا ہوں۔ اپنے خیالات اور شعر گوئی میں آخر میں نے صبح کر ہی لی۔ صبح چھ بجے سب سے پہلے حکیم بدھن اٹھے اور مجھ سے بولے۔

"یار کیا ساری رات جاگتے ہو۔؟"

میں نے کہا۔ "ہاں!"

وہ بولے۔ "گھبراؤ نہیں تمہیں اس کا بدلہ مل جائے گا۔ یہ روپے لو اور ٹی ٹی سے سکینڈ کلاس کے ٹکٹ بنوا لاؤ۔ غالباً گاڑی قریب آٹھ بجے پہنچے گی"

اگلا اسٹیشن آتے ہی میں ٹی ٹی صاحب کے چکر میں اسٹیشن پر اتر گیا۔ وہ مجھے ایک سکینڈ کلاس میں چائے پیتے ہوئے ملے۔ میں نے ٹکٹ بدلوا لیے۔ تقریباً سات بجے شعرائے کرام کا پورا قافلہ سکینڈ کلاس میں منتقل ہو گیا۔ سکینڈ کلاس کا

ڈبّا اس طرح بھر گیا کہ سوائے بیٹھنے کے لیٹنے کی جگہ کا امکان ہی نہ رہا۔ گاڑی جوں ہی منزلِ مقصود پہ پہنچی، باوردی ملازمین ریلوے پلیٹ فارم پر ایستادہ نظر آئے۔ گاڑی رکتے ہی سکینڈ کلاس کے ڈبے پہ یورش ہو گئی۔ گاڑی کل چار منٹ رکتی تھی۔ ایک موٹے سے خوش آدمی نے احکام دینا شروع کر دیئے۔ سارا سامان منٹوں میں اتر گیا۔ حکیم بڈھن اور تمام شعرائے کرام پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ اترنے کی دیر تھی کہ گاڑی روانہ ہو گئی۔ گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ موٹے سے آدمی جو احکامات صادر کر رہے تھے لپکتے ہوئے حکیم بڈھن کے پاس آئے اور بولے۔

"میرا نام اقبال نرائن کول ہے۔ میں ریاست کا منیجر ہوں۔ جناب راجا صاحب نے مجھے آپ اور دیگر شعرائے کرام کی سواری کے لئے بھیجا ہے۔ تشریف لے چلئے کاریں حاضر ہیں راجا صاحب بے چینی سے آپ کے منتظر ہیں۔"

حکیم بڈھن آگے آگے اور پیچھے پیچھے تمام شعرائے کرام اسٹیشن سے باہر آئے۔ تین کاریں موجود تھیں جن پر ہم لوگ بٹھا دیئے گئے۔ سامان ایک بس گاڑی پر رکھ دیا گیا۔ راج بھون صرف ایک میل پر تھا۔ پانچ منٹ سے کم عرصے میں ہم لوگ راج بھون پہنچ گئے۔ یہ ایک واقعی قلعہ نما بڑی حویلی تھی۔ جس کے سامنے بڑا سا میدان تھا جس میں دو رویہ شکاری خیمے نصب تھے۔ حویلی کے دروازے پر ایک سیاہ فام موٹے سے آدمی جن کے چہرے پر بے حد چیچک کے داغ تھے سفید چھین کرتا پہنے ہوئے مونچھیں کھڑے تھے۔ ان کے پاس ہی آٹھ دس آدمی مودبانہ انداز سے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی راجا صاحب ہونا چاہئیں۔ حکیم بڈھن ان کو دیکھتے ہی کار سے کود کر اترے

ادھر راجا صاحب بڑھے۔ دونوں بغلگیر ہوگئے۔ تمام شعرائے کرام اور میں بھی اتنے میں پہنچ گئے۔

راجا صاحب نے فوراً کہا۔

"بھیا بدھن ایک قہقہہ تو لگاؤ۔ تاکہ پرانی یاد تازہ ہوجائے"

حکیم بدھن نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے۔

"یار راجا صاحب تم بالکل نہیں بدلے"

وہ بولے "راجا واجا کی ایسی تیسی۔ ارے بھیا میں تو وہی راجن ہوں راجن کہو۔ تمہارے واسطے ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔ ورنہ میرا مزہ کرکرا ہوجائے گا۔ ایک کام کرو۔ ان حضرات سے میرا تعارف کرادو۔ اور ان کا سامنے کے خیموں میں قیام کرادو۔ تم میرے ساتھ ٹھہرو گے راج بھون میں"

چلیئے جناب ہم سب کا تعارف ہوگیا۔ راجا صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے ——— ہم لوگ خیموں میں پہنچا دیئے گئے۔ ایک ایک میں دو دو شاعر۔ ہم سب حکیم بدھن کو ملا کے دس آدمی تھے۔ حکیم بدھن تو راج بھون چل دیئے۔ نواں آدمی میں تنہا رہ گیا۔ لہذا ایک پورا خیمہ مجھے دیدیا گیا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا مجھے سونے کی سوجھی۔ بستر ریاست کی طرف سے پلنگ پر لگایا تھا۔ ارادہ کیا کہ لیٹوں۔ اتنے میں ناشتہ لے کر ایک باوردی ملازم اندر آیا ناشتے میں انڈے اور مکھن توس ملے۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ دو پیالیاں چائے کی پیں اور سوگیا۔ تقریباً ایک بجے مجھے کھانے کیلئے آدمی نے جگانا چاہا۔ لیکن میں نے انکار کردیا۔ میں تقریباً تین بجے سو کر اٹھا۔ اور شعراء کے خیموں میں گیا۔ سب

سو رہے تھے۔ میں نے دفع الوقتی کے لئے راجا صاحب کی شان میں ایک نظم لکھنا شروع کر دی۔ تقریباً اٹھارہ انیس اشعار کہہ کر میں نے نظم تمام کر دی۔ ٹھیک چار بجے پھر ناشتہ آیا۔ کئی طرح کے پھل تھے اور ہندوانہ نمکین سموسے اور چائے۔ میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ حکیم بڈھن گھبرائے ہوئے آئے اور مجھ سے بولے ــــ!

"یار بہزاد! بڑی چوک ہو گئی۔ آج ابھی پانچ بجے دربار ہو گا جس میں شعراء کو بھی قصیدے پڑھنا ہونگے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ مجھے اس کا علم ہی نہیں تھا۔ ورنہ تم سے تیار کرا لیتا۔ ابھی ابھی مجھ سے منیجر صاحب نے کہا۔ ورنہ دن پڑا ہوا تھا تم آسانی سے تیار کر دیتے"۔

میں نے کہا۔ "میں نے اتفاقاً بے خیالی میں ایک نظم کہی ہے۔ قصیدہ تو نہیں ہے لیکن راجا صاحب کی تعریف میں نظم ضرور ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ دربار پانچ بجے سے ہے۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ اور شعرا بھی آئے ہیں یا نہیں؟"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بھئی بڑے شکر کا مقام ہے کہ اور شعراء جن کو منیجر صاحب نے بلوایا تھا۔ آج نہیں پہنچے۔ غالباً مشاعرے میں پہنچیں۔ چلو تم پڑھ لینا اور دوں کی طرف سے میں معذرت کر لوں گا"۔

ٹھیک پونے پانچ بجے جملہ شعرائے کرام لکھنوی لباس میں آراستہ ہوئے میرے ہمراہ راج بھون پہنچے۔ درمیانی بڑے کمرے میں دربار ہوتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں بیک وقت پانچ چھ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ کمرے کی سجاوٹ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ دروں پر مخملی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں

اور ہال کھچا کھچ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم شعرا کو بالکل اگلی صفوں میں مخملی صوفوں پر بٹھا دیا گیا۔ سامنے ہی ایک ڈائس تھا جس پر درمیان میں ایک سنہری کرسی بچھی ہوئی تھی اور ادھر ادھر رو پہلی دو کرسیاں تھیں۔ ٹھیک پانچ بجے ایک طرف کا پردہ ہٹا۔ اور راجا صاحب زرنگار لباس میں برآمد ہوئے ان کے گلے میں ایک بڑا ہار پڑا ہوا تھا جس میں غالباً جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ سر پر ایک بھاری صافہ تھا جو پوری انداز سے بندھا ہوا تھا اور صافے پر ایک کلغی تھی۔ راجا صاحب کے ساتھ حکیم بڈھن اور منیجر صاحب تھے۔۔ راجا صاحب کو دیکھتے ہی حضار ہم وقد کھڑے ہوگئے اور راجا صاحب آکر سنہری کرسی پر بیٹھ گئے۔ دائیں جانب منیجر صاحب اور بائیں جانب حکیم بڈھن تھے۔ راجا صاحب کے بیٹھتے ہی "راجا بہادر کی جے" کے تین نعرے حضار نے بلند کئے۔ خاموشی ہوئی تو منیجر صاحب کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہوئے اس تقریر میں انہوں نے راجا صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور رعیت کے لئے جو آسانیاں اور راحتیں ان کے دور میں ہوئی تھیں ان کو سراہا۔ اور ان کی درازیٔ عمر کی دعا کی گئی۔ تقریر کے فوراً ہی بعد راجا صاحب کو نذر گزرنا شروع ہوئیں۔ ایک جاتا تھا نذر پیش کرتا تھا اور اتر آتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہوگیا۔ نذروں کے بعد منیجر صاحب نے کہا۔

"اب شعرائے کرام راجا صاحب کی خدمت میں اپنے ستائشی افکار پیش کریں گے"

اس پر حکیم بڈھن کھڑے ہوئے اور بولے۔

حضرات! یہ تمام شعرا مدعو کئے ہوئے نہیں تھے چونکہ اس پروگرام کا علم

نہیں تھا کہ آج قصیدہ خوانی بھی ہوگی۔ ورنہ یہ حضرات تیار ہو کر آجاتے۔ دربار سے کوئی گھنٹہ بھر قبل مجھے اس پروگرام کا علم ہوا ظاہر ہے کہ اب کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن میرے مکرم دوست اور شاعر حضرات بہزاد لکھنوی نے ایک ستائشی نظم اتنے کم عرصے میں لکھی ہے۔ میں اب ان سے درخواست کروں گا کہ وہ پورے شعرائے لکھنؤ کی نیابت میں عطا فرمائیں گے۔"

میں اس اعلان کے بعد ڈائس پر گیا۔ میری گریبان گیر ریل اور میری اختلاجی کیفیات کو مجمع پہلے ہی دیکھ رہا تھا۔ ڈائس پر دیکھ کر سب کے بشروں سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ یکایک میں نے نظم شروع کی۔ گو وقتی فکر تھی لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے ہال گونجنے لگا۔ خود راجا صاحب نے کئی مرتبہ بعض اشعار پڑھوائے۔ نظم پڑھ کر جب میں ڈائس سے اترا تو منیجر صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

"حضرت بہزاد صاحب کی نظم نے اس کوفت کو دور کر دیا۔ جو پروگرام کے فیل ہونے سے پیدا ہونے والی تھی۔ سبحان اللہ خوب نظم فرمائی ہے۔ اب آج دربار کی کارروائی ختم ہو رہی ہے۔ شام کو آتشبازی کا پروگرام ہے جو سامنے میدان میں چھڑائی جائے گی۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

رات کا کھانا واقعی بے حد پر تکلف تھا۔ راجا صاحب نے مسلمان باورچی بلوا کر کھانا پکوایا تھا۔ کھا کر مزہ آگیا۔ آتش بازی شب میں ۹ بجے شروع ہوئی مدتوں کے بعد میں نے آتش بازی دیکھی تھی۔ مزہ آگیا۔ عجیب عجیب قسم کی جدتیں

آتشبازوں نے پیدا کی تھیں۔ ایک آتشباز نے تو آتشبازی ہی کے ذریعے راجا صاحب تصویر پیش کی جس کو بے حد پسند کیا گیا۔

تقریباً ۱۰ بجے شب یہ پروگرام ختم ہوا۔ حکیم بڈھن آج ہم لوگوں سے دور ہی دور رہے۔ کھانے پر بھی ساتھ نہیں ہو سکا۔ بس وہ تھے اور راجا صاحب۔ گیارہ بجے ہم سب اپنے خیموں میں آگئے۔ اور تاش بازی شروع ہو گئی۔ تقریباً ایک بجے سب سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میں بھی سو گیا۔ صبح جب میں سو کر اٹھا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ کاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ پانچ شعرائے کرام جو منیجر صاحب کے طلبیدہ تھے اتر رہے ہیں۔ وہ میرے برابر کے خیمے میں ٹھیرا دیئے گئے۔

ایک صاحب بچ گئے جو میرے ساتھ اس خیمے میں ٹھیرائے گئے۔ میں ان پانچوں سے ناواقف تھا۔ دو بجا گلپوری تھے۔ دو گورکھپوری اور ایک صاحب چھپروی۔ چھپروی صاحب میرے ساتھ ٹھیرائے گئے جو مجھ سے فوراً بے تکلف ہو گئے۔ ناشتے پر بے تکلفی اور بڑھی۔ میری فرمائش پر اپنا کلام بھی سنایا۔ واقعی بے حد خوش آواز تھے اور غالباً گانے سے ربط تھا۔ تمام گانے کی ترکیبیں شعر خوانی میں ادا کرتے تھے مجھے اندازہ ہو گیا۔ ناشتے کے بعد ہی اور چاروں شعرائے کرام بھی آگئے۔ میری فرمائش پر دو چار اشعار بھی پڑھے۔ واقعی سب کے سب بہترین پڑھنے والے اور موسیقی سے واقف معلوم ہوتے تھے۔ کلام تو خیر واجبی ہی واجبی تھا۔ ان بلبلوں کے سامنے ہماری قمریاں واقعی گرد تھیں۔ کھانے پر لکھنوی اور غیر لکھنوی شعرا سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھے۔ تعارف ہوا اور اسکے بعد

کھانا۔ حکیم بڈھن اس وقت تک راج بھون سے برآمد نہیں ہوئے تھے۔ میں پریشان تھا کہ کسی طرح ان تک یہ خبر پہنچا دوں کہ ان کی قمریاں بلبلوں کے مقابلے میں یقینی ہار جائیں گی۔ میں اندازہ کیا یقین کر چکا ہوں۔ خدا خدا کر کے حکیم بڈھن سہ پہر کے ناشتے کے وقت میرے پاس آئے اور بولے۔

"چلو اندر رانی صاحبہ تمہاری نظم سننا چاہتی ہیں۔ میں تم کو لینے کے لئے آیا ہوں۔ یار راجہ صاحب تمہاری نظم سے بہت خوش ہیں"

میں نے کہا "چلو چل رہا ہوں لیکن ایک بات سن لو۔ یہ جو لکھنوی شعراء آئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمہاری ٹیم لازماً شکست کھا جائے گی۔ سب کے سب بہتر کیا پڑھتے ہیں اور بڑے خوش آواز ہیں"

حکیم بڈھن نے کہا "اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔ میں اپنی ٹیم کی شکست اپنی شکست سمجھتا ہوں اور اللہ غرور کا کلمہ نہ نکلوائے۔ حکیم بڈھن آج تک کہیں ہارا نہیں ہے"

میں نے کہا "اب کے تمہاری ہار لازمی ہے"

وہ بولے "کیوں منحوس کلمہ نکال رہے ہو زبان سے۔ چلو۔ دیکھو ایک تدبیر سمجھ میں آ رہی ہے۔ شاید کام نکل جائے"

میں جانتا تھا کہ یہ شخص ترکیب بنانے والی اسامی نہیں ہے۔ میں حکیم بڈھن کے ساتھ راج بھون پہنچا۔ ایک کمرے میں راجا صاحب مجھے منتظر ملے اور بولے۔

"بہزاد صاحب آپ کی نظم کے لئے رانی صاحبہ بہت بے چین ہیں۔

چلئے۔ میں، حکیم بڈھن اور راجا صاحب تینوں کئی کمروں سے گزرتے ہوئے ایک انتہائی سجے ہوئے کمرے میں پہنچے جہاں چارجانب گلابی صوفوں کا سٹ لگا ہوا تھا۔ اور کمرے کی ہر شے گلابی تھی۔ گلابی ساڑھی پہنے ہوئے ایک بے حد خوبصورت خاتون ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جن کو گھیرے ہوئے متعدد عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ راجا صاحب نے مجھ سے کہا۔

"بہزاد صاحب یہی رانی صاحبہ ہیں"

میں حیران رہ گیا۔ کبھی راجا کو دیکھتا تھا اور کبھی رانی کو۔ پہلو ئے حور میں لنگور خدا کی قدرت ہے۔ والی مثل صادق آرہی تھی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور حکیم بڈھن کے اشارے پر میں نے نظم شروع کی۔ مجھے یہ تعجب ہوا کہ میری نظم پر عورتیں تک واہ واہ کر رہی تھیں اور رانی صاحبہ تو کھلی جارہی تھیں۔ نظم کے خاتمے پر رانی صاحبہ نے ایک گلابی ریشمی تھیلی نکالی اور مجھے خود دیتے ہوئے بولیں۔

"بہزاد صاحب کیا کہنا؟ ابھی اغراض نہیں سنوں گی۔ مشاعرے کے دوسرے دن پھر تکلیف دوں گی"

میں حکیم بڈھن کے ساتھ باہر نکلا۔ مجھے خیمے میں چھوڑ کر حکیم بڈھن واپس چلے گئے۔ میں نے تنہائی میں وہ تھیلی کھول کر دیکھا۔ ایک سو ایک چاندی کے روپے تھے۔ اب میں پریشان تھا کہ یہ تھیلی رکھوں تو کہاں رکھوں۔ میرے پاس بجز اس جوڑے کے جو پہنے ہوئے تھا دوسرا جوڑا بدلنے کو بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی سوٹ کیس تھا اور نہ ہولڈال۔ آپ کو اب تو ایک سو ایک روپے کا وزن بھی شاید معلوم نہ ہو۔ سیر سوا سیر وزن شیروانی کی جیب میں جیب بن سکتا تھا

کسی اور کے پاس رکھلنے کا میں قائل نہیں تھا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔۔ آخر ایک تدبیر سمجھ میں آہی گئی۔ جو میرا ملازم ناشتہ لے کر آتا تھا مسلمان تھا میں نے اس کو بلایا۔ اس کا نام مسیتا خاں تھا۔ میں نے کہا۔

"یار خان صاحب ایک کام ہے کر دو گے؟"

"بولا حکم دیجئے صاحب میں تو ملازم ہوں۔"

میں نے کہا۔ نہیں بھائی! تم ملازم تو رہا صاحب گئے ہو۔ لیکن میرے تو بھائی ہو۔ کام یہ ہے کہ میرے پاس اس جوڑے کے سوا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہے۔ کیا یہاں گاڑھے کا تھان مل جائے گا۔؟"

وہ بولا۔ جی ہاں۔ اور اچھے سے اچھا"

میں نے کہا" اور کوئی درزی کرتا ہاتھ سے بھی سی دے گا؟"

مسیتا خاں بولے۔" حضور میرا بھائی خود درزی ہے۔ منٹوں میں سی کر دے دے گا۔"

میں نے ایک روپیا انعام کا مسیتا خاں کے ہاتھ میں تھمایا جس نے فوری کام کیا۔ وہ کام کاج چھوڑ کر مجھے لیکر بازار گیا۔ ایک تھان گاڑھے کا میں نے خرید کر مسیتا خاں کے بھائی کو دیدیا۔ جنہوں نے دو کرتے اور دو پاجامے مجھے سی کر دوسرے دن پہنچانے کا وعدہ کیا۔ انہیں کی معرفت میں نے سارے چاندی کے روپے دس دس کے نوٹوں کی شکل میں بدلوائے اور ان سے فوراً ایک تعویذ سلوا کر اس میں یہ نوٹ رکھے اور اپنے بازو میں باندھ کر مطمئن اپنی جائے قیام پر واپس آگیا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے ایک نجی صحبت مشاعرہ

دیکھی جس کی صدارت حکیم بڈھن کر رہے تھے۔ تمام قمریاں اور بلبلیں اکٹھا تھیں کوئی ریاستی شخص موجود نہیں تھا جس وقت بلبلیں چہک رہی تھیں تو میں نے حکیم کے چہرے پر ایک رنگ آتے ایک جاتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا وہ قمریوں کی شکست کا یقین کر چکے ہیں۔ واقعی وہ پانچوں شاعر بلا کے خوش آواز اور موسیقی کے واقف کار نظر آتے تھے۔ یکایک حکیم بڈھن نے کہا۔ "اب پندرہ منٹ کا وقفہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد لکھنؤ کے شعرا کو زحمت دی جائے گی۔ ان پندرہ منٹ کے عرصے میں، میں زعفرانی چائے تیار کر لوں۔ راجا صاحب نے فرمائش کر دی ہے بچپن میں وہ میرے ہاتھ سے بنوا کر پیا کرتے تھے اور اس چائے کے بڑے عاشق تھے آج انہوں نے مجھ سے اسی کی فرمائش کی ہے۔ آپ حضرات بھی پی کر دیکھئے۔"

اسٹوو پہلے ہی منگا لیا گیا تھا۔ وہ جادو حکیم صاحب نے ایک بڑی سی پتیلی بھر کر پانی اس پر رکھا اور پانچ منٹ بعد جب پانی کھول گیا تو اس میں چائے کا ایک مسالہ پڑیا لے کر چھڑک دیا پتیلی اتاری گئی۔ بغیر دودھ کی یہ چائے حاضرین کو تقسیم کر دی گئی۔ اور ایک بڑی پتیلی میں راجا صاحب کو بھی بھجوا دی گئی۔ آپ یقین مانیے ایسی لذیذ چائے میں نے آج تک نہیں پی تھی۔ زعفران کی خوشبو ایسی دلآویز تھی کہ جی لوٹا جا رہا تھا۔ میں نے اور تمام شعرا نے دو دو پیالیاں پیں اس پر بھی سیری نہ ہوئی۔ چائے کے بعد مشاعرے کی کاروائی شروع ہونے والی تھی کہ کھانا آ گیا اور یہ بھی حکم آیا کہ کھانا کھا کر سب حضرات مردانہ محفل موسیقی میں حاضر ہو جائیں۔

سب نے کھانا کھایا اور اسی دربار ہال میں پہنچے جہاں اب کرسیوں کے بجائے فرش کا انتظام تھا۔ کئی مشہور گویے ستار لیے ہوئے موجود تھے۔ راجا صاحب

اور حکیم بدھن کے آتے ہی محفل شروع ہو گئی۔ مجھے تو کوئی مزہ نہ آیا۔ بالکل بے کیفی سی ہوئی۔ لیکن اور شعرائے کرام بے حد محظوظ ہوئے۔ تقریباً بارہ بجے میں تو چلا آیا اور آکر سو رہا۔

صبح ناشتے کے بعد ہی بلبلیں آموجود ہوئیں اور ادبی صحبت کے افتتاح کے لئے حکیم بدھن کا انتظار ہونے لگا۔ حکیم بدھن آئے اور پھر شعرخوانی شروع ہوئی۔ آج قمریوں نے پہلے پڑھا۔ اس کے بعد بلبلوں کا نمبر آیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بلبلوں کی آوازیں بے حد بھاری اور گرفتہ تھیں کل کی سی صفائی بالکل نہ تھی انہیں کی فرمائش پر زعفرانی چائے پھر بنی اور دور شروع ہوا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد سب سونے چلے گئے۔ رات کو زنانی محفل موسیقی تھی۔ میں جب قمریوں کے ساتھ پہنچا تو بلبلوں کا پتا نہیں تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ طبیعتیں خراب ہیں اور آرام کر رہے ہیں۔ اس گانے اور ناچ میں بھی مجھے خاک مزہ نہ آیا۔ میں بارہ بجے واپس چلا آیا اور سو رہا۔

آج مشاعرہ کا دن تھا۔ دوپہر کو کھانا ہو رہا تھا کہ منیجر صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور حکیم بدھن سے بولے۔

"حکیم ان پانچوں شاعروں کی آوازیں بالکل بیٹھ گئی ہیں۔ کوئی دوا تجویز فرما دیں۔"

حکیم بدھن نے جو دوائیں لکھیں وہ یہاں کہاں مل سکتی تھیں۔ لہذا آدمی قریبی قصبے میں لے جایا گیا۔ اور شام کے قریب دوائیں آئیں۔ غرارے پر غرارے ہوئے۔ لیکن آوازیں نہ کھلنا تھیں نہ کھلیں بلکہ اور بھی بیٹھ گئیں

ٹھیک نو بجے اسی دربار ہال میں مشاعرے کے لئے لوگ جمع ہو گئے شعرائے کرام کو ایک ایک پھولوں کا ہار پہنایا گیا۔ ڈائس پر ایک زرنگار مسند پر راجا صاحب فروکش ہوتے۔ اوران کے برابر حکیم بدھن۔ منیجر صاحب نے سکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ ہر شاعر کو اپنے مقام پر کھڑے ہو کر پڑھنا تھا میں نے دیکھا کہ بلبلوں کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ یکایک منیجر صاحب نے کیف کا نام پکارا۔ کیف پڑھا اور اچھا پڑھا۔ پھر مسرت کی باری آئی وہ بھی خوب پڑھا دونوں کو خاصی داد ملی۔ اب بلبلوں میں سے چھیرے کی بلبل کا نام لیا گیا۔ وہ غریب کھڑا ہوا اور اپنی خرابی آواز کا عذر کیا اور سیدھا سیدھا پڑھ کر بیٹھ گیا۔ داد کیا ملتی۔ لوگ ترنم کے شوقین تھے۔ اب کی پھر لکھنوی شاعر اور بیکر گڑھ کے دونوں شاعروں کو یکے بعد دیگرے پکارا گیا۔ وہ بھی تحت اللفظ پڑھ کر بیٹھ گئے۔ پھر لکھنؤ والوں کی باری آئی۔ انہوں نے پڑھا اور خوب داد ملی۔ ان کے بعد بھاگلپوری حضرات نے پڑھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آوازیں بیکار تھیں۔ مسمسی داد ملی۔ پھر لکھنوی شعرا کا نام پکارا گیا۔ آخر میں میرا نام پکارا گیا۔ صاحب خدا جانے کیا تھا خود ستائی ہوگی۔ میری غزل نے مشاعرے کو گرما دیا خود راجا صاحب نے بے اختیار داد دینا شروع کی۔ کس کی مجال تھی کہ داد نہ دیتا۔ مجھے تابڑ توڑ تین غزلیں سنی گئیں اور یہ محفل مشاعرہ تین بجے رات کو ختم ہو گئی۔

⁂ ⁂ ⁂

دوسرے دن صبح کو جب میں سو کر اٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ بلبلیں سب کی سب واپس چلی گئی ہیں۔ صرف ہم لوگ ہی باقی رہ گئے ہیں۔ دن

تاش بازی میں کٹ گیا۔ رات میں ایک بڑے حد پرائیویٹ محفل ہوئی جس میں سوائے لکھنو والوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ راجا صاحب لے گئے۔ حکیم بدھن نے گایا۔ کیف نے طبلہ اور ندرت نے ہارمونیم بجایا۔ یہ محفل رات کو تقریباً دو بجے ختم ہوئی۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شعراء کی طلبی ہوئی۔ راجا صاحب نے ہر شاعر کو ایک ایک سرخ ریشمی تھیلی اپنے ہاتھ سے دی۔ ان کے ساتھ ہی مجھے بھی ایک تھیلی ملی۔ یہ رخصتی کی اجازت تھی۔ واپس آتے ہی سامان باندھا جانے لگا میں اتنی دیر میں بازار چلا گیا۔ اور وہاں سے پھر ان روپیوں کو نوٹوں میں بدلوا کر جب واپس آیا سب کا سامان تیار تھا۔ کاریں لگ چکی تھیں۔ راجا صاحب خود ایک ایک سے ہاتھ ملا کر اجازت دے رہے تھے۔ حکیم بدھن کو گلے لگا کر راجا صاحب رو پڑے اور انہوں نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار کر حکیم بدھن کو پہنا دی۔

منیجر صاحب خود اسٹیشن تک آئے اور تمام شعرائے کرام کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ خرید کر حکیم بدھن کو دیئے۔ اور سوار کرانے کے بعد رخصت ہو گئے ۔۔۔!

تھوڑی دیر تک تو ڈبے میں خاموشی رہی، پھر مجھ سے حکیم بدھن نے کہا "بھیا بہزاد! یہ ڈبا چھوٹا ہے۔ ہم دس آدمی اس ایک ڈبے میں کیونکر لکھنؤ کا سفر کر سکیں گے۔ اور جدا ہونا مجھے منظور نہیں کر کچھ اس ڈبے میں اور کچھ دوسرے ڈبے میں "

میں نے کہا۔ "پھر؟"

بولے۔ "اگلا جنکشن غالباً یہاں سے چوتھا اسٹیشن ہو گا۔ وہاں سب کے سب اتر چلو۔ میں ٹکٹ کلکٹر کو تمام ٹکٹ دیکر رسید لے لوں گا کہ سکنڈ کلاس میں سفر دہیں تک کیا گیا ہے۔ بقیہ کا مطالبہ ریلوے سے بعد میں مل جائیگا۔ تم ذرا لپک کر دس عدد تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خرید لینا۔ گاڑی بیس منٹ ٹھہرتی ہے اور آپ سب لوگ کسی تھرڈ کلاس میں آرام سے بیٹھ جائیے گا۔ جیسے ہی ساتھ ہو سکے گا۔"

تاب دم زدن کسے تھی۔ لیکن میں سمجھ گیا حکیم ٹکٹ کے پیسے بچانا چاہتا تھا سب مجھے کیا سجھا۔ اگلے جنکشن پر یہی ہوا۔ حکیم نے سکنڈ کلاس کے تمام ٹکٹ حوالے کر کے رسید لے لی۔ اور میں تھرڈ کلاس کے ٹکٹ لے آیا۔ جب ہم شعرا کو ڈھونڈتے ہوئے پلیٹ فارم پر آئے تو تمام حضرات ایک خالی تھرڈ کے ڈبے میں بستر کھولے ہوئے آرام کر رہے تھے اور تاش کی گڈی کھولی جا رہی تھی۔ گاڑی چلنے کے بعد حکیم بڈھن نے کہا۔

"حضرات آپ سب کو میرا ممنون ہونا چاہیئے کہ میں نے ان بلبلوں کی چہکار بند کی۔ ورنہ آپ سب حضرات ان کے مقابلے میں ناکام ہو جاتے، پیسے تو ملے ہی جاتے۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیسے؟"

بولے۔ "بھیا اس زعفرانی چائے کا یہ سارا کرشمہ تھا۔ میں نے ان حضرات کی پیالیوں میں ایک خاص دوا ڈالی دی تھی جو آواز کو بٹھا دیتی ہے ہم لوگوں نے

یہ غور نہیں کیا کہ ان حضرات کو پیا لیاں میں نے خود پیش کی تھیں۔"

میں نے کہا۔" یار غریبوں کی آوازیں چوپٹ ہو گئیں۔"

بولے۔" نہیں یار دو تین دن میں نمک کے غرارے کرنے سے کھل جائیں گی۔ اب تو مانتے ہو۔"

انتقام کا انتقام

آپ نے اب تک انتقام کے ہزاروں واقعات سنے ہوں گے لیکن یہ انتقام کے انتقام کا واقعہ اپنی نوعیت کا عجیب واقعہ ہے۔ ایسے انتقام کو شاعرانہ انتقام کہتے ہیں۔ کسی استاد کا بڑا مشہور شعر ہے ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

تو جناب شہرت کا یہ گر بے حد پرانا اور فرسودہ ہے۔ اور نصف صدی کی شہرت کا جو گر کامیاب اور مجرب ہے وہ یہ ہے کہ آپ شاعری شروع فرما دیں۔ ایک عدد تخلص رکھ لیجئے بس۔ آپ یقین مانئے۔ آپ کے والدین کا رکھا ہوا نام قطعی مٹ جائے گا۔ اور آپ اپنے تخلص سے مشہور ہو جائیں گے۔ اور یہاں تک کہ آپ بھی بھول جائیں گے کہ آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ شاعر کیونکر بنا جاتا ہے تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ آپ کسی شاعر فیکٹری کے خریدار بن جائیے۔ وہیں سے آپ کو ایک

عدد تخلص فریدی اور ایک عدد غزل بے قیمت مل جائے گی۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ جی
بھی یہ فیکٹریاں کہاں ہیں۔ ہیں ضرور اور کئی عدد ہیں۔ لیکن آپ یقین مانیں
میں بالکل لاعلم ہوں۔ ورنہ بغیر قیمت لئے آپ کو فیکٹری کا پتا بتا دیتا۔ اس
لاعلمی کی سب سے بڑی وجہ میری گوشہ نشینی اور کم آمیزی ہو گئی ہے لیکن
ہاں اب سے تینتس ۳۳ سال پہلے کی ایک شاعر فیکٹری کا کمال و تمام حال
آپ کو بتا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اس فیکٹری کا واحد کاریگر اور حکیم
بڈھن اس فیکٹری کے مینیجنگ پروپرائٹر تھے۔ یہ فیکٹری تحاس ہی ببا
صاحب کے چائے خانے میں اپنی مصنوعات تیار کرتی تھی۔ یہ "انتقام کا انتقام"
کا واقعہ بھی اسی فیکٹری کا ہے۔ سن لیجئے اور سوچئے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حکیم بڈھن نے آزمائشی مشاعرے میں سہیل کو شکست تو
دلوادی تھی۔ لیکن سہیل اس شکست کا باعث حکیم بڈھن ہی کو سمجھتا تھا۔
آخر وہ بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اور اس کو بخوبی معلوم تھا کہ بانکے مہتاب
علی کے پاس ساری مصنوعات اسی فیکٹری کی تیار شدہ ہوتی ہیں اگر حکیم
بڈھن چیالاکی نہ کرتے تو سہیل کو شکست ناممکن تھی۔ اس نے اس
شکست کے انتقام کی یہ تدبیر نکالی کہ فجو کے ہوٹل میں ایک شاعر فیکٹری چالو کر دی
فجو خود بھی ببا صاحب کے چائے خانے کو توڑنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی بکری بھی ببا
صاحب کے مقابلے میں بے حد کم تھی۔ اس نے بخوشی سہیل صاحب کو ایک کونے
میں میز اور کرسی رکھنے کی اجازت دیدی۔ سہیل نے فیکٹری چالو کرتے ہی حکیم بڈھن کے

گاہکوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ وہی کمپیٹیشن والی ترکیب۔ اپنی مصنوعات کے دام بے حد کم کر دیئے۔ مجھے حکیم بدھن کے تجارتی رموز کا کوئی علم تھا ہی نہیں۔ اس لئے کہ میں تو کاریگر تھا۔ مجھے اپنے دو روپے یومیہ سے غرض تھا۔ لیکن سہیل کی فیکٹری چالو ہوتے ہی میں نے حکیم بدھن کے گاہکوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ یہ تعداد میں آٹھ عدد تھے جو مستقل خریدار تھے علاوہ بریں مہتاب علی کے سننے میں یہ آیا کہ سہیل ایک روپیہ فی غزل کے حساب سے چارج کرنے لگا۔ سہیل واقعی ایک شاعر تھا اور بسیار نویس بھی۔ وہ اپنی غزل کے لیے اسی نوے شعر کہہ کر اس میں سے گیارہ انتخاب کرنے کا عادی تھا۔ اب یہ عالم ہو گیا کہ حکیم بدھن کے تمام مستقل گاہک ببّا صاحب کے چلائے خانے کی بجائے ججّو کے چائے خانے میں جانے لگے۔ میرے پاس بھی بے حد معمولی کام رہ گیا تھا لیکن میں نے حکیم بدھن کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہ دیکھتے ہوئے ایک دن کہا۔

"بھائی بدھن! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے!"

وہ مسکرا کر بولے "یار کہتے کیوں نہیں ہو، کیا میں ہوّا ہوں جو تم کو کھا جاؤں گا؟"

میں نے کہا "بھائی! تمہارے تجارتی رموز سے تو میں آگاہ نہیں ہوں لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے سارے مستقل گاہک اب تمہارے پاس نہیں آتے ہیں!"

حکیم بدھن نے کہا "ہاں یہ بات بالکل درست ہے اصل معاملہ یہ ہے کہ

انہیں نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے ایک فیکٹری کھولی ہے اور کمپٹیشن کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے قیمت بہت کم رکھی ہے۔ یعنی ایک روپیہ فی غزل۔ تو ظاہر ہے کہ یہ حضرات وہاں پہنچ گئے ۔"

میں نے کہا " تو تم بھی قیمت کیوں نہیں گھٹا دیتے۔ مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ تم کیا چارج کرتے ہو "

وہ بولے۔ " بھیا تم تماشا دیکھتے جاؤ۔ میں قطعی ریٹ نہیں گھٹاؤں گا۔ اگر میں آٹھ آنے کر دوں۔ وہ چار آنے پر آ تر آئے گا۔ میں دو آنے کر دوں وہ مفت دینے لگے گا۔ کمپیٹیشن میں یہی ہوتا ہے۔ میں اپنی مصنوعات کی قیمت قطعاً گھٹانے پر تیار نہیں ہوں "

میں نے کہا " تمہاری بات تو درست ہے لیکن اس کا حشر کیا ہو گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے معاوضے کی رقم یقیناً تم پر بار ہو گی "

وہ بولے " یار تم بھی نرے شاعر ہی رہے۔ ارے بھائی تمہاری رقم بھر کے گاہک تو موجود ہیں۔ اب رہا منافع تو وہ کچھ دن نہ سہی۔ تم دیکھتے جاؤ حکیم بدھن سے ٹکر لینا آسان کام نہیں ہے۔ یہیں مجھ سے بانکے میاں علی کا انتقام لے رہا ہے۔ میں بھی اگر انتقام کا انتقام نہ لوں تو تم مجھے حکیم بدھن نہ کہنا "

میں نے حیرت سے کہا " کس طرح انتقام لو گے؟ "

وہ بولے۔ " یہ راز کی بات ہے بتاؤں گا نہیں، میں نے اسکیم سوچ لی ہے "

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن میں ہوشیار ہو کر حالات کا جائزہ لینے لگا مجھ کے چبائے خانے میں بیٹھنے والے ایک صاحب اب حکیم بدھن کے پاس روز

آنے لگے۔ حکیم بڈھن ان کی تواضع میں دو تین روپے روزانہ خرچ کرنے لگے وہ صاحب، سہیل کی روزانہ کارگزاری کی مکمل رپورٹ دیتے تھے۔

ایک دن حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا۔

ارے بھئی بہزاد نئی خبر سنی۔ سہیل ایک ماہ کے لئے بہرائچ چلا گیا وہاں اس کی بیوی سخت علیل ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ تو اس کے سارے خریدار پھر تمہارے پاس آجائیں گے۔

وہ بولے۔ نہیں۔ وہ بڑا کائیاں ہے۔ اب کی پندرہ تاریخ کو جو انجمن نقاد ادب کا بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے اس کے لئے وہ تمام غزلیں بہرائچ سے نجمی کے ہوٹل کے پتے پر خریدار حضرات کو نام بنام لفافوں میں بھیجے گا۔ ان کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے۔"

میں نے کہا "واقعی بڑا چالاک آدمی ہے۔"

وہ بولے۔ "اگر وہ چالاک ہے تو میں چالاکی میں اس کا چچا ہوں۔ یار میرا نام بھی حکیم بڈھن نہیں اگر سہیل سے لکھنؤ نہ چھڑوا دیا ہو۔"

میں نے کہا "آخر کیا تدبیر سوچی ہے"

وہ بولے۔ "یار نہ پوچھو۔ نہیں بتاؤں گا۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں جس طرح اس کی تمام خبریں مجھ کو پہنچ رہی ہیں ویسے ہی میری تمام خبریں اس کو بھی پہنچتی ہوں گی۔ اچھا یہ بتاؤ تو طرحی مصرعہ انجمن بقائے ادب والوں نے دیا ہے مجھے سنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں اس زمین میں تمام اساتذہ ہند کی غزلیں موجود ہیں۔ کوئی آٹھ برس پہلے بنارس میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہو چکا ہے۔ میرے پاس ایک رسالے میں وہ تمام کی تمام غزلیں موجود ہیں اور طبع شدہ ہیں"

حکیم بدھن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بھیا ذرا گھر جا کر ابھی وہ رسالہ مجھے لا دو"

میں فوراً گھر گیا اور وہ رسالہ لا کر حکیم بدھن کے سپرد کر دیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دن گزر رہے تھے۔ انجمن نقاد ادب والوں نے واقعی کمال کیا تھا دعوت نامے علاوہ استادوں اور خوشگو شعراء کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی سے معمولی شاعر کو بھی دیئے تھے۔ اس کا انجام یہ تھا کہ ہر کس و ناکس مشاعرے کیلئے غزلیں لکھ رہا تھا۔ اور استادوں کے دولت خانے آباد نظر آرہے تھے۔ مشاعرے کو ابھی تیرا دن باقی تھے کہ میں نے ایک دن حکیم بدھن کو دیکھا کہ وہ محلے کے ڈکیئے کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلے خانے میں داخل ہوئے۔ ایک مرغن قسم کا آرڈر بیرا صاحب کو بہ آواز بلند دیا اور لگے کھل مل کر ڈکیئے سے باتیں کرنے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ حکیم چھوٹے آدمیوں کو لفٹ دینے کا عادی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ حکیم بدھن ڈکیئے صاحب کو لے کر میری میز پر آئے اور بولے۔

"بھیا بہزاد ان سے ملو۔ یہ میرے بڑے پرانے دوست ہیں۔ پانچویں درجے میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔"

میں نے اٹھ کر ڈکیئے سے ہاتھ ملایا۔

حکیم بڈھن پھر بولے یہ غریب پچھلے دو برس سے پڑھنا چھوڑ بیٹھے اور مجبوراً ڈاک خانے کی ملازمت کرنا پڑی۔ ہاں بھائی تمہارے درد سر کا کیا حال ہے؟"

ڈاکیے صاحب نے کہا۔ "یار کیا بتاؤں حکیم صاحب درد تو آٹھویں دسویں دبا لیتا ہے کیا بتاؤں کیا تکلیف ہوتی ہے۔"

حکیم صاحب بولے "تم کل آؤ۔ والد مرحوم کی مجرب ترین دوا اسی درد شقیقہ کی میرے پاس تیار موجود ہے۔ انشاء اللہ ایک ہفتے استعمال کے بعد تم کو کوئی شکایت نہ رہے گی۔"

اس کے بعد حکیم بڈھن اور ڈاکیے صاحب میں کچھ دیر کاناپھوسی شروع ہوگئی اور میں غزل کہنے میں مصروف ہوگیا۔ ناشتے کے بعد حکیم بڈھن نے ایک پانچ روپے کا نوٹ چپکے سے ڈاکیے کو پکڑا دیا اور بولے۔

"اس کی مٹھائی میرے بھتیجوں کے لیے گھر لیتے جانا۔"

اب تو ڈاکیے صاحب روز حکیم بڈھن کے پاس آنے لگے۔ حکیم بڈھن ان کی تواضع میں کسر نہ اٹھا رکھتے تھے اور وہ چلتے وقت ایک لفافہ چھپا کر حکیم صاحب کو دے جاتے۔

جب مشاعرے کے سات دن باقی رہ گئے تو میں نے حکیم بڈھن کے پرانے گاہکوں کو پھر حکیم بڈھن کے پاس آتے دیکھا۔ وہ آتے حکیم تواضع کرتے لیکن ان سے وہ اخلاق نہ برتتے جو پہلے برتتے تھے۔ مجھے بے حد حیرت ہوتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ پہلے سے ٹوٹ کر ادھر آ رہے ہیں۔ آخر حکیم اس سنہری موقعے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا۔"

یہاں تک کہ مشاعرے کو پانچ دن رہ گئے۔ دفعتاً حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا۔

"یار بہزاد تم کو فیکٹری سے دو دن کی چھٹی دی جاتی ہے۔ لو یہ دو دن کے چار روپے پیشگی۔ میں کانپور جا رہا ہوں اور دو دن بعد پلٹوں گا۔"

یہ دو برسوں میں پہلا موقع چھٹی کا تھا۔ ورنہ عید بقرعید کو بھی چھٹی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میں گھر چلا گیا۔

* * * * * *

مشاعرے سے تین دن پہلے حکیم صاحب واپس آ گئے۔ میں بھی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ پرانے گاہک برابر دواخانے کے چکر لگانے لگے۔ ان کے مایوس چہرے دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا۔ حکیم بڈھن ان آٹھوں حضرات سے کھنچا کھنچا سا رہا یہاں تک کہ مشاعرے کا دن آ گیا۔ اس دن ڈپٹی صاحب چہکتے ہوئے دواخانے میں آئے۔ اور حکیم سے بولے۔

"جناب حکیم صاحب آج آپ کا کام ہو گیا۔"

حکیم نے کہا "تمہارا بہت بہت شکریہ!"

تمام دن میں اپنی غزل پر نظر ثانی کرتا رہا۔ مجھے بھی مشاعرے میں غزل پڑھنا تھی۔

ٹھیک نو بجے میں اور حکیم بڈھن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ انجمن نقادانِ ادب نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ نواب چھاجو صاحب کی حویلی میں یہ مشاعرہ تھا۔ زمین کا فرش تھا۔ چہار جانب گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مشاعرہ گاہ ہنڈولوں کی روشنی میں جگمگا رہی

تھی۔ شعراء آرہے تھے اور حلقے کی شکل میں بیٹھتے جارہے تھے ہر طرف سے بسم اللہ بسم اللہ کا شور تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آٹھوں گاہک مشاعرے میں موجود نہ ہوں گے۔ لیکن جناب وہ تو سب کے سب موجود تھے اور حکیم بڈھن کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا۔

"یہ کیا بات ہے"

وہ بولے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یہاں تک کہ ٹھیک ساڑھے نو بجے شمع محفل صدر مشاعرہ کے پاس پہنچی۔ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ چہار جانب سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند ہوا۔ ابتدا چھوٹے شاعروں سے ہوئی تھی۔ لکھنؤ والوں کا مشاعرہ تھا مبتدیوں کا دل بڑھانے کے لئے تمام شعراء داد دے رہے تھے۔ مشاعرہ چلتا رہا۔ یہانتک کہ حکیم بڈھن کے ایک گاہک کی باری آئی۔ اس نے پرچا کھولا اور مطلع پڑھا۔ مجھے بے انتہا حیرت تھی۔ یہ مطلع منشی نوبت رائے نظر کا تھا۔ سارے مشاعرے پر ایک دم سے اوس پڑ گئی۔ لکھنؤ والوں کا مشاعرہ تھا کہیں سے کوئی آوازہ، کوئی ہوٹنگ نہیں ہوئی۔ لیکن مشاعرہ قطعاً خاموش تھا۔ اس نے شعر پڑھا یہ بھی نظر ہی کا تھا۔ دوسرا شعر پڑھا۔ وہ بھی نظر ہی کا تھا۔ اس نے سات نو شعر پڑھے۔ یہ تمام اشعار نظر ہی کے تھے۔ مقطع پڑھا۔ وہ بھی نظر کا تھا صرف تخلص بدلا ہوا تھا۔ مشاعرہ تمام وقت خاموش رہا۔ اب دوسرے گاہک صاحب

شروع ہوئے۔ یہ غزل اٹاوے کے مشہور شاعر جگت موہن رواں کی تھی وہ پڑھتے رہے۔ مگر مشاعرہ جوں کا توں خاموش رہا۔ اب یکے بعد دیگرے بقیہ چھ گاہکوں نے غزل خوانی شروع کی۔ سب کے سب حضرت علامہ سیماب حضرت نوح اور دیگر اساتذہ کی غزلیں پڑھتے رہے۔ ان غزلوں کے تخلص خود بدلے ہوئے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے کا وقت بدمزگی اور خاموشی میں گزر گیا۔ یہاں تک کہ آزاد صاحب بہار پڑھنے بیٹھے۔ یہ اچھا کہتے تھے اچھا پڑھتے تھے۔ مشاعرہ ہوا اور پھر داد کا شور بلند ہوا۔ واقعی بہار نے مشاعرہ جما دیا تقریباً ایک بجے میرا نمبر آیا۔ میں نے غزل پڑھی۔ غزل کے ختم ہوتے ہی حکیم بڈھن نے کہا۔

"یار بہزاد! اب نکل چلو۔ یہ مشاعرہ تو دن کے دس بجے سے پیشتر ختم ہوتا نہیں ہے"

جانا تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن چیلنجنگ پروپرائٹر کی حکم عدولی ایک کاریگر سے کیونکر ہو سکتی تھی۔ مشاعرے میں دس منٹ کا وقفہ پانوں کی تقسیم اور حقوں کی چلمیں بدلنے کے لئے دیا گیا۔ میں اور حکیم بڈھن دونوں مشاعرہ گاہ سے باہر آئے ہمارے ساتھ ہی وہ آٹھوں حضرات بھی باہر آگئے۔ اکبری دروازے تک راستہ بے حد خاموشی سے کٹا۔ اکبری دروازے کے باہر ایک چائے خانہ کھلا دیکھ کر حکیم بڈھن نے کہا۔

"آئیے آپ سب حضرات اندر چلئے چائے کا شغل ہی ہو جائے۔ کچھ تو تکان دور ہوگا"

چائے پیتے ہوئے ایک گاہک نے کہا۔

"جناب حکیم صاحب! ایک بات پوچھوں، جواب عطا ہوگا؟"
حکیم نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"ضرور پوچھو۔"
اس نے کہا۔ "آخر میری غزل میں کیا ایسی بات تھی جو مشاعرہ قطعی خاموش ہوگیا۔ کسی نے ہوں، ہاں بھی نہ کی۔ میرے خیال میں اشعار بہت اچھے تھے۔"
حکیم نے کہا: "بھائی بات یہ ہے کہ آپ سب صاحبان کو سزا ملی ہے۔"
وہ بولا۔ "سزا؟ آخر کس جرم میں؟"
حکیم نے کہا۔ ایک دیانت دار آدمی کو ٹھکرا دینا کیا کم گناہ ہے۔"
وہ بولا۔" اجی حکیم صاحب معموں میں گفتگو نہ کیجئے۔ صاف صاف بات کیجئے۔"
حکیم نے کہا۔" میاں دیکھو اصل معاملہ یہ ہے کہ آپ آٹھوں صاحبان نے جو غزلیں پڑھیں وہ آج سے آٹھ برس پہلے بنارس کے مشاعرے میں پڑھی جاچکی ہیں اور استاذہ کی تھیں۔"
ایک اور خریدار صاحب جو ذرا دل چلے اور گرم مزاج معلوم ہو رہے تھے بولے۔

"وہ دوسروں کی تھیں۔"
حکیم نے کہا۔" ہاں وہ دوسروں کی تھیں اور شائع بھی ہوچکی ہیں۔"
انہیں صاحب نے کہا۔
"اس کا ثبوت دیجئے حکیم صاحب۔"

حکیم نے وہ رسالہ جو میں نے دیا تھا نکال کر سامنے رکھا اور کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ مشاعرہ بالکل خاموش ہو گیا۔ وہ تو یہ کہئے کہ شرفاء کا مجمع تھا ورنہ آپ حضرات پر آوازے کسے جاتے اور بڑی بے عزتی ہوتی۔"

تمام صاحبان رسالہ کھول کر دیکھ رہے تھے واقعی وہ تمام کی تمام از مطلع تا مقطع رسالے میں چھپی ہوئی تھیں۔

انہیں گرم مزاج نے پھر کہا۔

"تو یہ اس سہیل مردود نے ہم کو دھوکا دیا۔"

حکیم نے کہا۔ بھائی ناراض ہونے کی بات نہیں۔

شاعری کھیل نہیں ہے جسے بچہ کھیلے

ہم نے پچپن برس اس راہ میں پاپڑ بیلے

میاں کسی زمین میں سو دو سو شعر لکھنا اور اچھے لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ جب سر کا پسینہ ایڑی تک آجاتا ہے تب کہیں اشعار ہوتے ہیں۔ غریب سہیل کرتا تو کیا کرتا۔

وہی دل جلے صاحب بولے۔

"تو آخر ہم سے دام کیوں لئے سہیل نے۔"

حکیم صاحب بولے "دام آپ سے کیا لئے ایک روپیا فی غزل بھائی جیسا گڑ ڈالو گے ویسا میٹھا ہوگا۔ اب مجھے دیکھو کسی صاحب کو مجھ سے ایسی شکایت ہوئی ہے۔ آج تک ہوئی ہو تو بولے۔ دام چوکھے لیتا ہوں مال بھی چوکھا دیتا ہوں۔"

پہلے صاحب بولے۔ ”بھائی حکیم صاحب ہماری خطائیں معاف فرمائیے ہم سب بھٹک گئے تھے اس کم بخت سہیل نے ہماری آبرو خاک میں ملا دی۔ بڑی بعد اور کرکری ہوئی ہم لوگوں کی۔ اب آپ پھر ہم لوگوں پر نگاہ عنایت فرمائیے“

حکیم بدھن نے مشفقانہ انداز سے کہا۔

”مجھے آپ سب حضرات کی خدمت کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن جس ریٹ پر آپ حضرات سہیل سے لیتے تھے میرے بس کا نہیں ہے میرے ریٹ وہی رہیں گے“

ان دل جلے صاحب نے کہا۔ ”اس کمبخت کو آنے دیجیے حکیم صاحب اگر اس کی مزاج پرسی نہ کی تو کچھ بھی نہ کیا“

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

شاعرے کے دوسرے ہی دن سے فیکٹری پھر زور شور سے چلنے لگی۔ ٹوٹے ہوئے خریدار تمام پھر آ گئے اور اپنے ساتھ ان خریداروں کو لیتے آئے جو سہیل نے خود تیار کئے تھے۔ میں نے حکیم بدھن سے کہا۔

”یار بدھن یہ تم نے کیا جادو کر دیا۔

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

بھیا ہزارہ فیکٹری چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایسے ایسے ابھی خدا جانے اور کتنے مواقع آئیں گے۔ بھیا بات یہ ہے کہ سہیل نے میرے خریدار توڑ لیے تھے مجھے ایک ایک پل کی خبر ان حضرات سے ملتی تھی جو حرام کی چائے پینے روز میرے پاس

کرتے تھے۔ جب مجھے خبر ملی کہ سہیل بہرائچ گئے ہیں اور وہاں سے غزلیں نام بنام لفافوں میں مجھو کے ہوٹل کے پتے پر آئیں گی تو میں نے ڈاکئے سے دوستی گانٹھ لی ورنہ تم جانتے ہو کہ میں تھرڈ کلاس آدمیوں سے بات کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ ان کی تواضع اور پانچ روپے کا ایک نوٹ کام کر گیا۔ جتنے خطوط ان حضرات کے نام مجھو کے پتے پر آئے وہ ڈاکئے صاحب نے میرے حوالے کر دیئے۔ سب میں سہیل نے غزلیں لکھ کر بھیجی تھیں۔ میں نے وہ تمام ضائع کر دیں۔ ادھر یہ حضرات میرے پاس آ آ کر خوشامد کرنے لگے کہ میں اپنی فیکٹری سے مال سپلائی کر دوں لیکن میں صاف انکار کر گیا۔

میں نے کہا "تمہیں انکار میں سر ہلاتے میں نے بھی دیکھا تھا۔"

وہ بولے "پھر میں نے تمہارے دیئے ہوئے رسالے سے آٹھ غزلیں استادوں کی نکالیں۔ ان کو علیحدہ علیحدہ لکھوایا۔ لفافوں میں بند کیا اور تم کو دو دن کی چھٹی دے کر خود بہرائچ گیا۔"

میں نے حیرت سے کہا "خود بہرائچ گئے تھے۔ مجھ سے تو کانپور کہا تھا۔"

وہ بولے "بھائی میں اپنا راز کسی سے نہیں کہتا۔ اور دوسرے کے ہاتھ سے خط ڈلوانے میں راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ ایک گاڑی سے پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے خطوط سپرد ڈاک کرنے کے بعد میں دوسری گاڑی سے واپس لکھنؤ آ گیا۔ وہ غزلیں ان حضرات کو مل گئیں۔ یہ خوشی خوشی مشاعرے میں پہنچ گئے۔ تم نے دیکھا سب کیسے اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ پڑھنے کا نتیجہ مل گیا۔"

میں نے کہا "یار کہیں سہیل کی کمبخت نہ ہو جائے۔ یہ سب گرمائے ہوئے ہیں۔"

حکیم بڈھن قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

"یار انتقام کا انتقام تو پورا اسی طرح سے ہوگا!"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایک ہفتے کے بعد سہیل لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں کچھ نامعلوم حضرات نے ان کی پٹائی کر دی اور وہ مستقلاً لکھنؤ چھوڑ کر بہرائچ چلے گئے۔

یہ ہے انتقام کے انتقام کا واقعہ ——— کہیے کیسی رہی؟

انتقام کے

انتقام کے

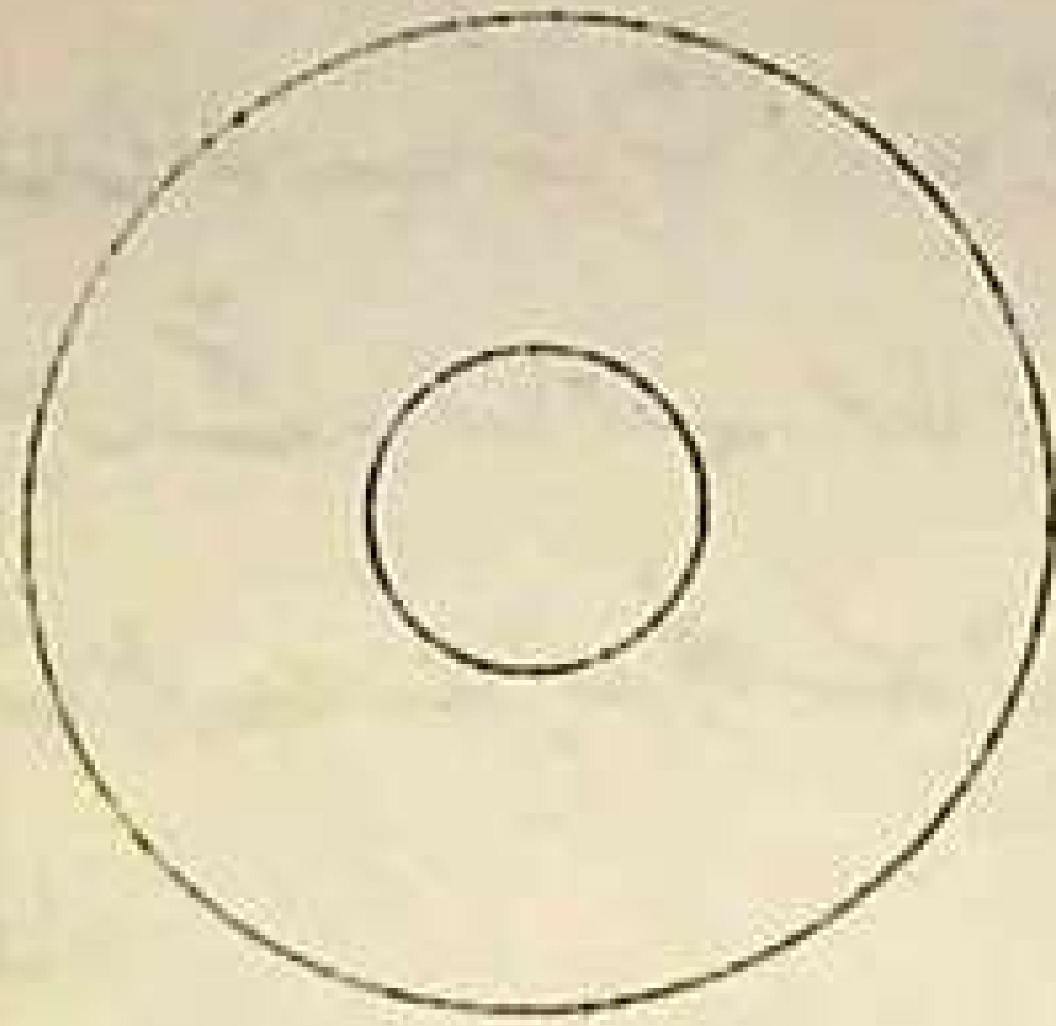
انتقام کا انتقام

٦









یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

تو جناب یہ ایک شاعر کا فرمودہ ہے، شاعر کی کیفیت ہے۔ شاعر کا جذبہ ہے عوام تو خیر عوام ہیں، شعراء خاص طور پر اس سے متاثر کیوں نہ ہو۔ وہ کب اور کیوں کر؟ اس کا جواب آپ کو ذیل کی سچی آپ بیتی میں ملے گا۔ پڑھیے اور

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

دن عید اور رات شب برات تھی۔ حکیم بدھن کی شاعر فیکٹری کا کام بہ ہزار خوبی چل رہا تھا۔ حکیم بدھن صبح ۸ بجے فیکٹری پہنچ جاتے تھے مجھے ۵ بجے پہنچنا پڑتا تھا۔ بس نماز فجر پڑھی اور چل دیا۔ اس کے لئے ناشتہ فیکٹری میں مقرر تھا عام طور پر رات کے نو بجے تک اور بعض دفعہ رات کے بارہ بجے تک چلائے تھی شاعر تھے اور غزلیں تھیں۔ حکیم بدھن کی فیکٹری نے اور فیکٹریوں کا دیوالا نکال

دیا تھا۔ حسب خواہش مضامین کو نظم کرنا ہر فیکٹری کے امکان میں نہیں تھا حکیم بڈھن میں ایک خاص غرور اور ایک خصوصی انداز تکبر بھی پیدا ہو گیا تھا۔

ایک شب اصلاح الادب کے مشاعرے میں میرا سامنا سہیل سے ہو گیا حکیم بڈھن میرے ہمراہ نہیں تھے۔ صاحب سلامت کے بعد سہیل نے مجھ سے کہا۔

"بھیا بہزاد! مشاعرے کے بعد مجھ سے مل لینا کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں"۔

میں نے کہا: "اچھا"۔

مشاعرہ تقریباً ایک بجے ختم ہوا۔ واپسی پیدل ہوئی۔ سہیل اور میں دونوں ٹہلتے ہوئے نخاس کی طرف چلے۔ سہیل نے مجھ سے کہا۔

"بھیا بہزاد حکیم صاحب کا کیا حال ہے۔ اب تو شہر میں وہی وہ رہ گئے"

میں نے کہا" ہاں اللہ کا فضل ہے۔ تم بہرائچ سے کب آئے"۔

سہیل کہنے لگے" یار تمہارے حکیم بڈھن نے جو حرکت کی وہ بڑی غیر شریفانہ تھی۔ انسان کو شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں نے ان کی فیکٹری کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ میری فیکٹری کو نقصان پہنچا لیتے۔ میری ذات کو کیوں نقصان پہنچایا"۔

میں نے کہا۔" بھائی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ نہ اس پلان میں میں شریک تھا۔ نہ مجھے اس کا پہلے سے علم تھا"۔

وہ بولے" مجھے بخوبی معلوم ہے۔ تم تو محض شعر کہنے کی مشین ہو اور بس وہ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ کسی کو اپنے راز میں شریک نہیں کرتا۔ لیکن سب سے زیادہ دکھ جو مجھے ہوا وہ لکھنؤ چھوٹنے کا ہوا۔ ایک سال میں نے بہرائچ اور

نانپارہ جیسے مقامات میں بسر کیا میرا ہی دل جانتا ہے کہ مجھ پر کیا گزری۔ نہ وہاں کوئی ادبی ماحول ہے نہ ادبی فضا۔ میں نے گھٹ گھٹ کر ایک سال گزارا۔ میں چاہتا تھا کہ شہر میں اس واقعے کی یاد باقی نہ رہے چنانچہ پرسوں آگیا۔ اور آتے ہی میں نے دیکھا کہ لوگ اس واقعے کو فراموش کر چکے ہیں۔"

میں نے کہا" اس واقعے کی حقیقت تمام شہر کو کیا معلوم تھی چند حضرات پہ وہ سانحہ گزرا تھا بس وہ اس کا ذکر بھی کسی سے نہیں کر سکتے تھے۔ تم خواہ مخواہ لکھنؤ چھوڑ بیٹھے۔"

سہیل بولے۔" بھیا مناسب یہی تھا۔ وہ لوگ میرے دشمن جان ہو چکے تھے۔ اگر لکھنؤ نہ چھوڑتا تو وہ مجھے مشاعروں میں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے۔ میرا لکھنؤ چھوڑنا ہی مناسب تھا۔ وہ لوگ اس واقعے کو بھول گئے ہیں۔ اور اب تو سبھی سب تمہاری فیکٹری کے مستقل خریدار بن گئے ہیں۔

میں نے کہا" ہاں تمہیں خبر صحیح ملی ہے۔"

وہ بولا" ہاں مجھ سے ان حضرات سے ملاقات بھی ہوئی۔ وہ لوگ اخلاق سے ملے۔ وہ بات تو نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ اظہار نہیں ہوا۔ لیکن ہاں سنو۔ میں قوم کا مغل ہوں مغل سمجھے مغل۔ میں جو وار کرتا ہوں ظاہر کر کے لہذا تم حکیم بڈھن سے کہدینا کہ اب وہ میرے انتقام کے لئے تیار ہو جائیے۔"

میں نے کہا" یار جانے بھی دو۔ چھوڑو ان پرانی باتوں کو۔"

وہ بولا۔ بھیا۔ چھوڑنا کام چرسی مار کا ہے۔ مغل کا نہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن فیکٹری آتے ہی میں نے حکیم بدھن سے سارا واقعہ بلاکم و کاست بیان کر دیا۔ اور سہیل کے اس چیلنج پر اظہار افسوس کیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

یار بہزاد! اختلاجی آدمی ہو نا۔ ڈر گئے۔ اجی مر گئے انتقام لینے والے سہیل بے چارہ کیا چیز ہے ''

میں خاموش ہو گیا۔ میرے پاس چارہ ہی کیا تھا۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ایک دن ڈاکیا حکیم بدھن کو پوچھتا ہو چائے خانے میں آیا۔ حکیم بدھن نہیں تھے بابا صاحب کے کہنے پر اس نے لفافہ میرے حوالے کیا اور چلا گیا۔ حکیم بدھن کا یہ پہلا خط تھا جو چائے خانے کے پتے پر آیا تھا۔ لفافہ عطر میں بسا ہوا تھا۔ خط کا پتہ زنانی تحریر میں تھا حکیم بدھن نے آج تک اپنے کسی رومان کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ خود اس کی بیوی مر چکی تھی۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ننہال میں پرورش پا رہے تھے جن کا خرچ حکیم بدھن ہر ماہ بذریعہ منی آرڈر بھیجا کرتے تھے۔ مجھے اس لفافے میں رومان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً دو بجے دن کو حکیم بدھن چائے خانے میں آئے میں نے وہ لفافہ ان کے حوالے کیا۔

حکیم بدھن نے پہلے تو اظہار حیرت کیا۔ پھر لفافہ کھول کر پڑھا وہ خط پڑھتے جاتے تھے اور ان کے چہرے پر مسرت کے آثار رونما ہوتے جا رہے تھے۔ خط پڑھ کر انہوں نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولے۔

"یار میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ پڑھو"

یں نے پڑھا۔ گلابی رنگ کے بے حد خوبصورت کاغذ پر زنانی تحریر میں وہ خط کیا تھا محبت نامہ تھا۔ نواب قیصر کے وہاں ایک حالیہ مشاعرے میں ان مسماۃ نے حکیم بڈھن کو دیکھ لیا تھا۔ تیر نظر کلیجے کے پار ہو چکا تھا۔ اس دن سے اختر شماری میں راتیں اور بیقراری میں دن گزر رہے تھے پتا اور نام نہ معلوم ہونے کے باعث اور بھی اضطراب تھا۔ اتفاقاً ان کے چچازاد بھائی جو شاعر تھے (تخلص نہیں بتایا گیا تھا) مشاعرے میں شریک تھے ان سے بر سبیل تذکرہ حکیم بڈھن کا ذکر آ گیا۔ وہ حکیم صاحب کے مشاغل اور خیکمرٹی سے بھی واقف تھے۔ انہیں سے پتا ملنے کے بعد یہ پہلا خط بھیجا گیا تھا اور ایک طرح بھی لکھی گئی تھی کہ اس پر ایک غزل لکھ کر اس پتے پر روانہ کر دی جائے۔ خود مسماۃ بیوہ تھیں۔ عمر اٹھارہ سال لکھی گئی تھی اور یہ بھی لکھا گیا تھا کہ صورت بھی وہ خود ہی نکال کر بذریعہ خط بھیجیں گی۔ نیچے گیتی آرا بیگم گیتی لکھا ہوا تھا۔ میں نے خط پڑھ کر کہا۔

"یار مبارک ہو۔ تم واقعی آدمی حسین ہو۔ جامہ زیب ہو اور اس حسن نے رنگ دکھا ہی دیا۔"

وہ تیں سلام کرتے ہوئے بولے۔

بھیا بہزاد اس خط نے تو میرے صبر و سکون کی دنیا لوٹ لی ہے تم سے کیا چھپاؤں تمہاری بھاوج کے انتقال کے بعد میرا ارادہ تھا کہ عقد ثانی بھی کر لوں۔ لیکن اندھا سودا مجھے پسند نہیں تھا۔ میں انگریزوں کی طرح دیکھ بھال کر نکاح کرنے کا قائل ہوں۔ چنانچہ تم سے کیا پردہ۔ میری اگلی زندگی

کچھ اچھی نہیں گزری۔ خیالات اور مزاج کا اختلاف ہمیشہ رہا۔ پھر ۱۹۲۶ء
ان کے انتقال کے بعد آزادی ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تقریباً تمام وقت
فیکٹری اور احباب کی نذر کر دیتا ہوں۔ اب میرے خوابوں کی تعبیر نکلنے کی امید
یہ ہو چلی ہے۔ بس بھیا ذرا ایک زوردار غزل اس زمین میں تو جلدی سے لکھو۔

میں نے کہا: "بھیجے گی کیسے پتا تو مجھے نظر نہیں آیا۔"

وہ ہنسے اور بولے۔ "یار تم تو آنکھوں والے اندھے ہو۔ ارے بھائی!
نام کے نیچے گلاب کا پھول بنا ہوا ہے۔ اس میں نہایت چالاکی کے ساتھ پتا
درج ہے۔ سفید مکان کونے کا بازار لکھنؤ۔"

میں نے وہ خط لے کر دوبارہ پڑھا۔ واقعی گلاب کے پھول میں پورا پتا درج
تھا۔ وہ تمام دن حکیم نے بے حد احتیاط میں کاٹا۔ فرمائشی غزل کے ہر ہر شعر کو
کئی بار مسترد کیا گیا۔ آخر کار شام کو بہ ہزار خرابی وہ غزل پاس ہوئی۔ حکیم بدھن
تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس خط کو نکال کر پڑھتا تھا اور بے حد مسرور نظر آتا
تھا۔ قریب شام کے حکیم نے ایک نیلے رنگ کا لفافہ اور کاغذ نکالا اور
مجھ سے کہا۔

"بھیا ذرا لکھو تو جو میں کہوں۔"

میں نے کہا "کیا جواب خط لکھوانا چاہتے ہو۔ خود کیوں نہیں لکھتے۔"

وہ بولا "استاد سمجھدار لوگ اپنی تحریر اس وقت تک ظاہر نہیں
کرتے جب تک یقین نہ ہو جائے۔"

میں تو نوکر آدمی تھا خط لکھنے بیٹھ گیا۔ حکیم بدھن نے بڑا اشتیاق دار مضمون

بولنا شروع کیا۔ اس خط کا قرار واقعی جواب لکھوایا۔ بے قراری، اضطراب، شوق، آرزو، غرض کوئی کیفیت ایسی نہ تھی جو جواب میں نہ ہو۔ آخر میں وہ غزل لکھوائی اور لفافے پر پتا لکھوانے کے بعد اپنے ہاتھ سے سپرد ڈاک کر دیا۔

دوسرے دن خلاف معمول حکیم بڈھن ۶ بجے نہ آئے۔ میں احکام کے انتظار میں سوکھ گیا۔

دن کے دو بجے حکیم بڈھن ہنستے ہوئے چائے خانے میں داخل ہوئے اور بولے۔

"یار بہزاد! تم تو انتظار میں سوکھ گئے ہو گے۔ چلو کسی دن تو تمہارے دماغ کو چھٹی ملنی چاہیے۔"

میں نے کہا: "آخر تم تھے کہاں؟"

وہ بولے "یار ایسی تگ و دو میں تھا اس خط کے متعلق جہاں یقین تھا وہاں شبہ بھی تھا۔ میں نے پوری تحقیقات کی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیا نتیجہ نکلا؟"

ہنس کر بولے "سوالا آنے درست۔ واقعی کھاری کے بازار میں ایک سفید مکان ہے جس میں ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ ان کی ایک صاحبزادی گیتی آرا بیگم ہیں۔ عمر بھی اٹھارہ سال صحیح ہے اور چندے آفتاب، چندے ماہتاب بھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ مرزا صاحب تک کی معلومات تو خیر معمولی بات ہے لیکن یہ گیتی آرا بیگم صاحبہ کا جغرافیہ کیسے معلوم ہو گیا؟"

وہ بولے "بڑے پاپڑ بیلنا پڑے۔ اس محلے میں میری ایک عزیزہ بھی رہتی ہیں۔ جن کے وہاں میں آج تک نہیں گیا تھا۔ مکان اور پتا بھی صحیح معلوم نہ تھا۔ صرف محلے کا علم تھا۔ پوچھتا پاچھتا بہ ہزار دقت وہاں تک پہنچا۔ ان سے بڑی ہیر پھیر کے ساتھ گفتگو کی۔ وہ مرزا صاحب کے وہاں جا چکی تھیں۔ ان سے پورے حالات کا علم ہو گیا۔"

میں نے کہا۔ "مبارک ہو یار۔ خدا کرے تمہاری نیا پار لگ جائے۔"

چوتھے دن پھر ایک خوشبودار لفافہ ڈاکیا لا کر دے گیا۔ حکیم ڈاک کے وقت برابر موجود رہتا تھا۔ اس نے لپک کر اس لفافے کو کھولا۔ خوشی اور مسرت کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ خط پڑھا اور پڑھتے ہی میرے حوالے کر دیا۔ اس خط میں بے قراری اور اشتیاق ملاقات کا بے انتہا ذکر تھا۔ القاب میں پیارے اور دل کا چین لکھا ہوا تھا۔ غزل کی بھی فرمائش تھی۔ اور پچھلی غزل کا بعد شکریہ بھی تھا اور سب سے زیادہ دلخوش کن بات یہ تھی کہ اسی دن شام کے چھ بجے اپنی آمد کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور لکھا گیا تھا کہ میں تانگے پر ہوں گی۔ آپ گلے کو چہ ان کے پاس میرا چھوٹا بھائی بیٹھا ہو گا۔ سائیکل تیار رکھی جائے۔ تانگہ دھمتی کے کنارے والی سڑک پر ہوتا ہوا امین آباد جائے گا۔ جہاں کچھ سامان خریدنا ہے۔ سائیکل پر پیچھے پیچھے تعاقب کیا جائے۔ اور کچھ گلوریاں پان کی عمدہ بنوا کر ضرور ساتھ لے لی جائیں۔

حکیم خط پڑھتے ہی اچک گیا تھا۔ مجھ سے بولا۔

"میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔ کپڑے بدلوں گا اور ٹھیک ساڑھے چار بجے

آؤں گا۔ تم ذرا خریداروں کا خیال رکھنا۔"

اس وقت دو بجے تھے۔ حکیم سیدھا روانہ ہو گیا۔ میری بھی جان بچی تھی میں اس دن کی فرمائشات کی تکمیل میں کھو گیا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے حکیم بدھن چھیلا بنے ہوئے مسکراتے ہوئے چائے خانے میں داخل ہوئے۔ اعلیٰ درجے کا کامدانی انگرکھا جس کے نیچے گلابی رنگ کا کرتا بڑی بہار دے رہا تھا۔ سر پہ دوپلی ٹوپی۔ سفید چوڑیدار پاجامہ اور سیاہ پمپ۔ عینک کا فریم بھی نیا تھا۔ غالباً فریم فوری بدلوایا گیا تھا۔ ایک ہاتھ میں چاندی کی پانوں کی ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں ریشمی رومال مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"یار بتاؤ۔ کیسا لگ رہا ہوں۔ تمہیں خدا کی قسم جھوٹ نہ بولنا۔"

میں نے کہا۔" یار آج تو تم واقعی قتلِ عام کر سکتے ہو۔"

قہقہہ مار کر ہنسے اور جھکے تین تسلیم کرتے ہوئے بولے۔

"یار نظر نہ لگانا اور ہاں بھیا ذرا ایک سائیکل تو شیخ جی کی دکان سے کرائے پر لے آؤ۔ سب سے اچھی ہو خیال رکھنا۔"

میں گیا اور دس منٹ میں سائیکل لے کر چائے خانے کے باہر کھڑی کر دی۔ ٹھیک ۵ بجے ایک تانگا جس کے آگے پیچھے پردہ بندھا ہوا تھا آکر چائے خانے کے سامنے رکا۔ کوچوان کے برابر ایک بارہ تیرہ برس کا خوبصورت سا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس لڑکے نے ایک پیالی چائے کا آرڈر دیا جو اس کو فوراً سپلائی ہو گئی حکیم بدھن اس عرصے میں باہر نکل چکے تھے اور سائیکل کا ہینڈل تھام کر منتظر تھے۔ میں بھی

باہر نکل آیا۔ میں نے پردے کے باہر نازک نازک گوری گوری چند انگلیاں دیکھیں جو پردے کو تھامے ہوئے تھیں۔ پانچ منٹ میں چائے ختم ہوتے ہی تانگا فرنگی محل کے پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ پیچھے پیچھے حکیم بدھن سائیکل پر سوار جا رہے تھے ——————— میں چائے خانے میں بیٹھ گیا۔ قریب رات کے آٹھ بجے حکیم بدھن کی واپسی ہوئی۔ میں سائیکل واپس کرنے شیخ جی کی دکان چلا گیا۔ واپسی پر میں نے حکیم بدھن سے کہا۔

"شیر کر بھیڑ"!

حکیم بدھن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بھیا! ہم تو سدا کے شیر ہیں شیر (راز داری کے انداز میں بولے) یار میرے کیا بتاؤں روح تک وجد کر رہی ہے۔ اللہ نے گیتی آرا کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ دیکھنے کے بعد رہی سہی صبر کی طاقت بھی جواب دے گئی۔ بھیا بہزاد تمہارا حکیم بدھن مر گیا۔

میں نے کہا "مریں حکیم بدھن کے دشمن۔ ہوا کیا؟"

بولے۔ تم شاعر لوگ جتنی بے قراریاں اور ہجر کی تکالیف نظم کرتے ہو۔ میں ان سے کہیں زیادہ بے قرار اور پریشان ہوں۔ ہوتا کیا۔ گومتی کے کنارے والی سڑک تک تو سامنا نہیں ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی جب پردہ ہٹا تب مجھے خدا یاد آ گیا۔

میں نے کہا "بات چیت بھی ہوئی؟"

بولے "ہاں میں نے سائیکل قریب کرلی تو آہستہ آہستہ گفتگو ہوئی"

میں نے کہا "کیا باتیں ہوئیں ہے؟"

وہ شرماتے ہوئے بولے۔

"بھیا وہ تو مجھ سے زیادہ بیقرار ہے اور مجھے پرسوں رات شب میں ۹ بجے گھر بلایا ہے۔ اس کے والد اور دوسرے بھائی بٹیروں کے شکار کو چلے جائیں گے۔ باہر ایک دروازہ ہے جو زینے کا ہے اور سیڑھا اوپر جاتا ہے۔ وہیں مجھے پرسوں ۹ بجے شب پہنچنا ہے"

میں نے کہا "مبارک ہو یار۔ مطلوب خود ہی طالب ہے۔ سبحان اللہ اس کو کہتے ہیں چھپر کا اور دو دو۔ اپنی آنا ہیں کیا رہا"

وہ بولے "کچھ نہیں کوئی سو ڈیڑھ سو کا سامان پسند کیا۔ میں نے دلوا دیا"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

وہ رات تو کٹ گئی۔ دوسرا دن حکیم بدھن کے لئے پہاڑ سے کم نہ تھا سارا دن وہ مضطرب اور بے چین رہا۔ گھڑی گھڑی مجھ سے گیتی آرا کی باتیں کرتا اور اس کو ان باتوں سے سیری نہ ہوتی۔ اس دن اس نے مجھے غزلیں کہنے کی بھی فرصت نہ دی۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی تمام ہوا۔ دوسرا دن تو کوہ ہمالیہ سے بھی لمبا تھا۔ کسی طرح رات ہونے کو نہیں آتی تھی۔ غضب گھڑی کا سارا کا سارا چوپٹ تھا۔ خدا خدا کر کے سات بجے۔ حکیم بدھن سیدھے گھر بھاگے۔ اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دولھا بنے ہوئے چلتے چائے خانے میں آئے — ہاتھوں میں پھولوں کا گہنا تھامے ہوئے عطر میں بسے ہوئے۔ مجھے چھٹی دی اور سیدھے کھالے کے بازار تانگے پر روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح میں چائے خانے میں بیٹھا ہوا حکیم بدھن کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن حکیم بدھن نہ آنے تھے نہ آئے۔ میں نے سوچا کہ حکیم بدھن غالباً سو رہے ہوں گے۔ تقریباً گیارہ بجے حکیم بدھن بے حد افسردہ ہوٹل میں داخل ہوئے ان کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ جن کی مرہم پٹی کی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"خیریت؟"

بولے "ہاں ذرا سیڑھیوں پر پھسل گیا تھا اس سے چوٹیں آگئیں۔ مرہم پٹی کی وجہ سے دیر ہو گئی"

چائے خانے والے تو ان کے بیان پر مطمئن ہو گئے۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ تخلیہ ہونے کے بعد حکیم بدھن نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بھیا غضب ہو گیا۔ سہیلی کمبخت نے انتقام لے ہی لیا!"

"ہوا کیا۔ صاف صاف تفصیل سے بتاؤ" میں نے کہا۔

بولے "میں ٹھیک نو بجے اس زینے کے پاس پہنچا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں نے حسبِ قرارداد تین دستکیں دیں۔ وہ کمبخت گویا تیار کھڑی ہوئی تھی۔ اور مجھے ہاتھوں ہاتھ اوپر لے گئی۔ ایک مختصر سی چھت تھی اور ایک چھوٹا سا کمرہ۔ چھت پر ایک پلنگ پڑا ہوا تھا۔ جس پر ایک پرتکلف بستر بچھا ہوا تھا۔ مجھے بٹھانے کے بعد وہ پان لگانے بیٹھ گئی۔ اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں کپڑے اتار کر آرام سے بیٹھ جاؤں۔ گھر میں سوائے اس کی ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے انگرکھا اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی اور بیٹھا ہی تھا کہ اس کے

والد اور بھائی لکڑیاں لئے ہوئے کمرے سے باہر آئے اور مجھے چور چور کہہ کر پکڑ لیا۔ وہ کمبخت گیتی آرا بھی ان کی ہمنوا ہو گئی۔ ان لوگوں نے مجھے ہزاروں گالیاں بھی دیں اور زدوکوب بھی کیا۔ میں کچھ بھی زبان سے نہ کہہ سکا۔ اس لیے کہ حالات ہی ایسے تھے۔ میں ان کے گھر ان کے محلے اور زنان خانے میں تھا اس کے بھائی تو مجھے پولیس میں دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے باپ نے کہا کہ اگر یہ پانچسو روپے کے پرونوٹ پر دستخط کر دیں تو ان کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "تم نے کیا کیا؟"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "جو عقل تقاضا تھا۔ پانچسو روپے کے پرونوٹ پہ جو پہلے سے تیار رکھا ہوا تھا۔ میں نے دستخط کر دیئے اور اندر گھا بہن کر باہر نکلا۔ اوپر سے اترتے وقت اس کے باپ نے ایک پرچا کاغذ کا مجھے تھما دیا۔ وہ یہ ہے پڑھ لو۔

میں نے پڑھا اس میں لکھا تھا۔

"یہ سہیل کا انتقام ہے۔ سمجھے"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

حکیم بڈھن کو فریب عشق کھائے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ چوٹیں بھی اب کافی مندمل ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی خاموشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی ہنسنے اور مسکرانے والا حکیم بڈھن اب ہمہ وقت سنجیدہ اور خاموش رہتا تھا۔ خریداروں کی آمد پہ کبھی زیادہ التفات اور خوش اخلاقی سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس مصیبت پر ایک اور مصیبت یہ آپڑی۔ اور وہ یہ تھی کہ بٹا صاحب کے چلائے خانے کے بالکل برابر

ایک نیا چائے خانہ شہر کے ایک مشہور بدمعاش فضلو نے کھول لیا اور اس میں سہیل مع اپنے خدمتگاروں کے روزانہ آکر بیٹھنے لگے۔ جب بھی حکیم بڈھن ادھر سے گزرتے ان پر ایک زوردار قہقہہ بلند کیا جاتا۔ میں دیکھتا تھا حکیم بڈھن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا تھا کہ حکیم نے چائے خانے سے بجز کسی کام کے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ ان حالات سے میں ڈر رہا تھا کہ کوئی نئی بات ہونے ہی والی ہے۔ چنانچہ ہو کر رہی۔ ایک دن حکیم بڈھن نے کہا۔

"یار بہزاد! تمہارے پاس نواب سنجو کے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "آیا ہے کئی دن ہو چکے۔"

وہ بولے "غزل بہت سنگرتی لکھنا اور ہاں شاید تم کو اس کی خبر نہ ہو کہ اس مشاعرے میں سہیل کو خطاب دیا جانے والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیسا خطاب؟"

وہ بولے۔ "میر الشعراء۔ اور اسی غرض سے شہر کے تمام بہترین شاعر بد عہد کئے گئے ہیں۔ بڑا اہتمام ہے۔ میرے جاسوس نے پکی خبر دی ہے۔ اور ہاں یہ بھی سن لو میاں سہیل اپنے خسر اور سالے کو بھی خاص طور پر مشاعرے میں لا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا سہیل کے خسر اور سالے بھی شاعر ہیں؟"

حکیم بولے۔ "اجی نہیں۔ وہ لوگ تو شاعری کے سخت دشمن ہیں اور ہمیشہ سہیل کو تنبیہہ کرتے رہتے ہیں کہ شاعری چھوڑ دو۔ منحوس چیز ہے۔ وہ ان پر دھونس ڈالنے کے لئے مشاعرہ میں لا رہا ہے کہ وہ لوگ دیکھیں کہ شاعر کی کتنی وقعت اور

عظمت شہر میں ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں خطاب والی ترکیب سہیل کی ہی ایجاد تو نہیں ہے۔"

وہ بولے۔ یار تم باوجود شاعر ہونے کے ہو سمجھدار میاں سب ہی سمجھتے ہیں نواب کی ساری شاعری کا دارومدار سہیل پر ہے۔ اب کیا وہ ایک خطاب بھی اس کے عوض نہیں دے سکتے۔ اور ہاں دیکھو میں پھر کہہ رہا ہوں۔ غزل تگڑی ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا میرے بغیر نہ جانا۔"

میں نے کہا۔ "اس محفل میں جاؤ گے جہاں سہیل کو خطاب سے نوازا جائیگا؟"

وہ بولے۔ "اس کے گھر تو محفل نہیں ہے۔ محفل تو نواب سنجو کے یہاں ہے۔ میرے پاس بھی دعوت نامہ خاص نواب سنجو کا آدمی لے کر آیا ہے۔

* * * * * * *

اس مشاعرے کو ایک ہفتہ باقی تھا۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔ لیکن حکیم بدھن کو چھیڑنے کے لئے فضلو کے چائے خانے سے اب آوازوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ وہ حضرات جب بھی حکیم بدھن کو دیکھتے تو قوالی شروع ہو جاتی۔

عشق میں اپنی پٹائی ہو گئی
اس طرح سے جگ ہنسائی ہو گئی

اس قوالی پر سہیل کے زوردار قہقہے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔ مجھے بے حد رہ رہ کر وہم ہوتا تھا کہیں حکیم بدھن کی عدیم الفرصتی میں سہیل سے وابھی

اور اس حرکت پہ شکوا بھی کیا اور منع بھی کیا۔ اس پر وہ بولا۔

"بھائی بہزاد! تم اس معاملے میں نہ بولو۔

میں خاموش رہا کرتا بھی تو کیا کرتا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ایک ہفتہ گزر گیا شہر میں مشاعرے کی بڑی دھوم تھی۔ لیکن کانپور میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی اسی تاریخ کو تھا جس میں تقریباً تمام خوش گو اور اچھے شعراء مدعو ہو گئے۔ نواب سنجو سے لوگوں نے لاکھ کہا کہ تاریخ بڑھادی جائے۔ لیکن وہ تیار نہ ہوئے مجھے حکیم بدھن کی زبانی معلوم ہوا کہ چونکہ سہیل کے خسر اور سالے کو اس ماہ میں سوائے اس تاریخ کے فرصت ہی نہیں مل سکتی تھی لہذا مشاعرہ بڑھایا نہیں جا سکتا۔ مطلب تو محض خطاب حاصل کرنا تھا میں نے مشاعرے کے لئے بڑی معرکے کی غزل کہی۔ کانپور کے مشاعرے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ حکیم بدھن کی مرضی یہی نہیں تھی۔ حکیم بدھن نے وہاں سے ملنے والی رقم خود دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

ٹھیک نو بجے میں اور حکیم بدھن دونوں نواب سنجو کی حویلی پہنچ گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ حویلی کے کشادہ صحن میں قالینوں کا فرش تھا گیس کے بے شمار ہنڈولں سے صحن جگمگا رہا تھا۔ نواب سنجو اور سہیل مہمانوں کی پیشوائی کے لئے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے حکیم بدھن کو دیکھ کر سہیل کے چہرے پر نفرت کے آثار نمودار ہوئے۔ میری طرف لپکتے ہوئے سہیل نے کہا۔

"بھائی بہزاد! میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

تم نے اس مشاعرے کے لئے کانپور کا مشاعرہ چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا۔" تعلقات سے زیادہ اور کوئی چیز اہم نہیں ہوتی۔"

مجھے لے جاکر بڑے اہتمام سے صف شعراء میں بٹھایا گیا۔ حکیم بڈھن خود مجھے چھوڑ کر صف سامعین میں چلے گئے۔ شعراء آتے رہے۔ بسم اللہ بسم اللہ کے شور سے محفل گونجتی رہی۔ ٹھیک دس بجے مشاعرہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ ایک برقعہ پوش عورت دو تین آدمیوں کے ساتھ مشاعرہ میں داخل داخل ہوئی۔ تمام شعراء حلقے میں بیٹھ چکے تھے۔ اس عورت نے نقاب الٹتے ہوئے کہا۔

"جناب نواب سنجو صاحب مجھے ایک بہت ضروری بات آپ سے کہنی ہے۔"

کل حاضرین حیرت سے عورت اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے۔ میں اس عورت کو پہچان گیا۔ یہ نکٹی فتو نامی عورت تھی اور بدنام کردار کی مالک تھی۔ راجا کے بازار میں اس نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جہاں وہ پیشہ ورانہ زندگی گزارتی تھی۔

نواب سنجو صاحب نے کہا۔

"میرے پاس اس وقت کسی کی بات سننے کا وقت نہیں ہے۔ میرے یہاں مشاعرہ ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ مشاعرہ شروع ہونے والا ہے اس وقت جاؤ کسی اور وقت آنا۔

وہ بولی۔" نواب صاحب اگر آپ کے پاس وقت نہیں ہے تو میرے

شوہر کے پاس تو وقت ہونا چاہئے۔"

نواب سنجو نے کہا" کون شوہر۔ تم اپنے شوہر کو بخوشی یہاں سے لے جا کر کہیں بات کر سکتی ہو۔ مشاعرہ کیوں خراب کر رہی ہو؟"

اس نے کہا" بہت اچھا جناب! آپ سہیل صاحب سے کہیئے کہ میرے ساتھ ذرا باہر چلے آئیں۔"

سہیل نے حیرت سے فتو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم مجھے بلا رہی ہو۔ میں تو تم سے واقف بھی نہیں ہوں۔ تم ہو کون بلا؟"

وہ تالی بجا کر بولی۔

" آخاہ! میں بلا ہوں۔ بہت خوب! میں وہی بلا ہوں جس سے دو برس ہوئے تم نے نکاح کیا تھا اور آج تک روٹی کپڑے کو ترسا رہے ہو یہ بھی خوب رہی۔ ایک تو سامنا نہ کرنا اور جب ملنا تو بلا کہنا۔ میرے ساتھ میرے باپ بھائی بھی موجود ہیں وہ تم سے پوچھیں گے کہ تم نے مجھے بلا کس طرح سے کہا؟"

نکاح کے لفظ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والے بھاری بھر کم آدمی کھڑے ہوگئے اور انہوں نے کہا۔

کیا کہا۔ نکاح؟ تم سے سہیل نے نکاح کیا ہے۔

فتو نے کہا۔ جی ہاں نکاح کیا ہے۔ نکاح نامہ میرے پاس موجود ہے اور گواہ بھی ابھی آ کر سے نہیں ہیں۔"

وہ مونچھوں والے صاحب سہیل کے خسر تھے (جو مجھے بعد میں معلوم

ہوا) ان کے ساتھ ہی ایک ہٹے کٹے سے جوان آدمی تھے وہ بولے۔

"دکھاؤ نکاح نامہ کہاں ہے؟"

فتّو نے ایک سرخ رنگ کا روغنی کاغذ نکالا اور بولی۔

"میں آپ کے ہاتھ میں نکاح نامہ نہیں دونگی۔ نواب چھبو صاحب لیں اور مجھے واپس کر دیں۔

نواب چھبو نے بڑھ کر نکاح نامہ لے لیا اور پڑھنے کے بعد کہا۔

"نکاح نامہ تو درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جعلی نہیں ہے اصلی ہے؟"

فتّو نے کہا "اس کا ثبوت تو عدالت میں مل جائے گا۔ اگر ضرورت ہوئی۔ ابھی گواہ مرے نہیں ہیں۔ اللہ کے فضل سے زندہ ہیں۔ ایک گواہ تو اس مشاعرے میں بھی موجود ہیں"

سہیل نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا۔

"گواہ کون ہے پیش کر۔

فتّو نے کہا۔

"حکیم بڈھن صاحب آپ کھڑے ہو کر سچ سچ بات کیوں نہیں کہتے۔

حکیم بڈھن صف سامعین میں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور بولے۔

جی ہاں ایک گواہ میں ہوں"

حکیم بڈھن کی گواہی پر سارا شور ختم ہو گیا۔ لوگ سنجیدہ ہو گئے نواب چھبو نے نرم ہو کر کہا۔

بھئی دیکھو! اس معاملے کا یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ تم کو عدالت سے چارہ جوئی کرنی چاہیئے۔ ہم لوگ یہاں شعر خوانی کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ تم نے خواہ مخواہ میرا مشاعرہ ختم کر دیا۔ اگر سہیل صاحب تمہارے شوہر ہیں تو تمہارے نان نفقے کی ادائیگی کریں گے اور اگر نہیں ہیں تو تمہیں غلط الزام اور ذلیل کرنے کے سلسلے میں بھگتنا ہوگا۔"

فتنو نے نرمی سے کہا۔ نواب صاحب مشاعرہ آپ نے خود خراب کرایا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ خاموشی سے الگ چلے چلتے تو اتنی شہرت نہ ہوتی۔ آپ مجھے سمجھا دیتے میں گھر چلی جاتی۔"

فتنو اور اس کے ساتھی واپس چلے گئے۔ مشاعرے پر ایک عجیب سناٹا سا چھا گیا۔

غریب سہیل کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کے خسر اور سالے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ مشاعرے کا یہ رنگ دیکھ کر نواب سنجو نے کھڑے ہو کر کہا۔

"حضرات! میں آپ کی تشریف آوری کا بے حد ممنون ہوں۔ لیکن اتفاقی واقعے کی بنا پر جو افسردگی اور بے کیفی چھا گئی ہے۔ اس میں شعر خوانی نہ سمجھ میں آ رہا ہے اور نہ کامیاب ہوگی۔ مجھے جناب سہیل سے بیحد ہمدردی ہے اور یقین ہے کہ اس عورت نے ان پر غلط الزام لگایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ جناب حکیم بدھن صاحب کی گواہی اس امر کی شاہد ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہے۔ بہر نوع یہ کام عدالت کا ہے۔ ہمارا

نہیں ہے کہ ہم فیصلہ کریں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آج کا مشاعرہ ملتوی کر دیا جائے۔ اور اگلا ہفتہ اس مشاعرے کے لئے مقرر ہو جائے۔"

دوسرے دن فضلو کے ہوٹل میں نہیں اور ان کے شاگرد نظر آئے حکیم بدھن مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے۔

"کہو بہزاد! انتقام کے انتقام کے انتقام کا انتقام کیسا رہا؟"

میں نے کہا "یار بدھن! مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ غریب نہیں کی آبرو کر کری ہو گئی۔ وہ لکھنؤ میں اب شکل دکھانے کے لائق نہیں رہا"

وہ بولے "اب وہ گھر میں بھی شکل دکھانے کے لائق نہیں ہے۔ اس کے خسر اور سالے بے حد سخت آدمی ہیں اور اس کی بیوی کی زبان بھی کترنی سے کم نہیں چلتی ہے۔ مزا آ جائے گا چچا کو"

میں نے کہا "یہ سب آخر ہوا کیوں کر"

وہ بولے "بھائی انتقام کی کوئی شکل میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ روزانہ کے قہقہوں اور قوالی نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ آخر کار یہ ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ فتو اور اس کے ماں باپ میرے گاؤں کے پرانے کاشت کار ہیں۔ میں نے ان پر زمیندارانہ دھونس ڈالی۔ چار آنے کا یہ ردی نکاح نامہ خرید لیا۔ ایک مرے ہوئے مولوی صاحب کے دستخط اس پر بنا لیے۔ گواہوں میں میرے ہی گاؤں کے چند آدمیوں نے دستخط کر دیئے"

میں نے کہا "لیکن گواہوں میں تم نے دستخط کیوں کیے"

وہ بولا۔ "ورنہ سہیل کو یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ یہ میرا انتقام ہے۔ میں پرزے پرزے کر کے ہاتھ میں تھمانے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اگر اس نے فتوبرا ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا تو کیسی رہے گی۔"

حکیم بڈھن بولے۔ "غیر ممکن۔ اس کو اپنی بدنامی کا خوف ہے ابھی تک تو مشاعرے والوں کو علم ہے۔ مقدمے کے بعد شہر بھر کو معلوم ہو جائے گا۔"

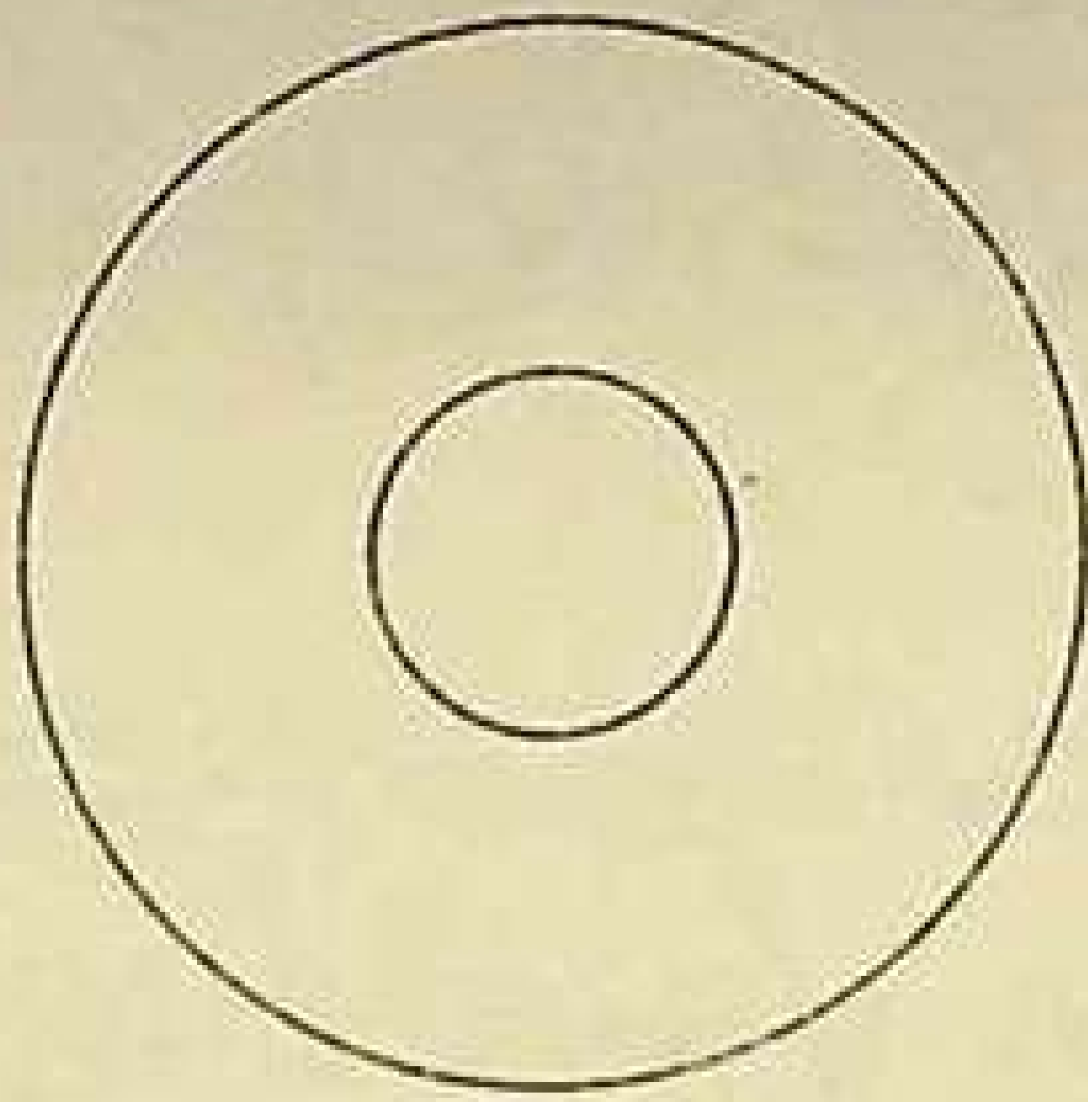
میں نے کہا۔ "اچھا چلو یہ مان لیا۔ اور اگر اس نے وہ تمہارے پرونوٹ کے لئے مقدمہ دائر کر دیا تو پانچسو روپے دینے پڑیں گے کہ نہیں۔؟"

وہ بولے۔ "اجی بیٹھے رہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے۔ میں تین طریقوں سے لکھنے کا ماہر ہوں۔ میرے پرونوٹ والے دستخط میری تحریر سے ملیں گے ہی نہیں میں حکیم بدطینت ہوں بڈھن۔ کچی گولیاں کھیلنا نہیں جانتا۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

سننے میں آیا کہ سہیل نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر دی اور کلکتے چلے گئے ان کی بیوی سے ان کی طلاق ہوتے ہوتے رہ گئی۔

کہیے حکیم بڈھن زندہ باد!!!



شاعر بنا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو بن بنا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

کیا جانے نظیرؔ اکبر آبادی کا یہ شعر ہے یا کسی اور کا، لیکن ہے بڑی سچی بات۔ میں تمام دن بابا صاحب کے چائے خانے میں یہی بات اور یہی منظر دیکھا کرتا تھا۔ حکیم بڈھن کی میز پر ایک آیا شاعر بنا، دوسرا آیا شاعر بنا۔ چائے کی پیالی مسلسل گردش میں رہا کرتی تھیں۔ میں روز روز کی اس دماغ پاشی سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر کوئی کہاں تک شعر کہے۔ لیکن مجبور تھا۔ اگر شعر نہ کہتا تو روز کے دو روپے کہاں سے نظر آتے۔ اس وقت میں تفریح کے اوقات بھی نکل آتے تھے اور وہ حکیم بڈھن کے لطیفے اور قہقہے تھے۔ ظالم بات بات پر ہنستا اور ہنساتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

"بھیا بہزاد! آج ذرا تیار رہنا۔ میں تمہاری ملاقات ایک اپنے بہت پرانے دوست سے کرانے والا ہوں۔"

میں نے کہا کون صاحب ہیں وہ"

وہ بولے۔ اماں نواب ہیں اور بہرائچ کے ضلع میں جو چھوٹا لکھنؤ ہے۔ وہاں سے آئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کوئی مشاعرہ کر رہے ہیں اسی لئے دعوت دینے آرہے ہیں"

میں نے کہا "تم جسے چھوٹا لکھنؤ کہہ رہے ہو اب میری سمجھ میں آگیا۔ لیکن جب تم نام لینا نہیں چاہتے تو میں نام کیوں لوں؟ کیا وہاں مشاعرہ ہو رہا ہے"

وہ بولے۔ "ہاں میں نے سنا ہے"

میں نے کہا "اور تم جاؤ گے وہاں"

وہ بولے۔ "کیوں نہیں جاؤں گا۔ آج کل پانچ چھ نئے خریدار بیرونی مشاعر یں شرکت کے لئے بہت بے چین ہیں۔ ان پر میرا احسان بھی ہوتا ہے"

میں نے کہا "یہ سب سچ ہے لیکن تم کو معلوم ہے کہ تمہارا جانی دشمن بھی وہاں موجود ہے۔ تم نے اس سے لکھنؤ چھڑوا دیا ہے۔ اس کو ذلیل کرایا ہے وہ کیا تم کو اپنے شہر میں چھوڑ دے گا"

حکیم بڈھن نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"یار بہزاد! تم واقعی اختلاجی آدمی ہو۔ تم کو رسی بھی سانپ ہی نظر آتی ہے۔ ارے میاں حکیم بڈھن موم کا بنا ہوا ہے جو سہیل پگھلا دے گا"

میں نے کہا۔ یوں تمہاری مرضی ہے۔ تم ماننے والے آدمی تو ہو نہیں... میری سمجھ میں جو بات آئی وہ میں نے کہہ دی"

میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ چائے خانے میں ایک... بھاری بھر کم صاحب

داخل ہوئے۔ لباس قطعی لکھنوی تھا۔ انگرکھا۔ چوڑی دار پاجامہ، دو پلڑی ٹوپی۔ لیکن ہاتھوں میں متعدد انگوٹھیوں نے یہ بات صاف کہہ دی کہ لکھنوی نہیں قصباتی ہیں۔ ان کے داخل ہوتے ہی عطر خس کا تیز بھبکا محسوس ہوا۔ وہ حکیم بڈھن کو دیکھتے ہی لپکے اور بڑھ کر بغلگیر ہو گئے۔

حکیم بڈھن نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"یار چھوٹے نواب، ماشاء اللہ آج کل خوب تگڑے ہو رہے ہو۔"

وہ جواباً قہقہہ مارتے ہوئے بولے۔

"ہاں بھیا۔ آج کل مریض عشق نہیں ہوں۔ مریض شعر ہوں۔"

حکیم بڈھن نے ان کو بٹھاتے ہی بلند آواز سے بالائی دار تین پیالیوں کا آرڈر دیا۔ اور مجھے بھی پاس آنے کا اشارہ کر کے اپنی میز پہ بٹھا لیا۔

میرے پہنچتے ہی چھوٹے نواب سے بولے۔

"بھیا ان سے ملو۔ یہ میری جان ہیں۔ دل ہیں کلیجا ہیں۔ آنکھیں ہیں۔ جناب بہزاد لکھنوی!!"

چھوٹے نواب نے مجھ سے اٹھ کر ہاتھ تو ملایا لیکن میری مفلسانہ وضع قطع ان کو پسند نہیں آئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہنا پسند نہیں کیا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے بھی کیا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی چھوٹے نواب بولے۔

"بھیا حکیم۔ اسی ہفتے کی رات کو میں نے ایک مشاعرے کا اعلان کر دیا ہے گونڈہ، بہرائچ، گورکھپور، بستی اور جرول روڈ سے کئی شعرائے کرام کو مدعو کر لیا ہے یہاں میں خود مدعو کرنے کے لئے آیا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس ہفتے کی

تاریخ کے لئے مجھے کوئی مشہور شاعر لکھنؤ سے نہیں مل رہا ہے۔ سب کے سب کانپور کے آل انڈیا مشاعرے میں مدعو ہیں"

حکیم بدھن نے کہا "ہاں یہی حال ہے۔ مشہور تو مشہور تمہیں دوسرے درجے کے شعراء بھی نہیں مل سکیں گے، وہ سب کے سب مدعو ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء اور کانپور کے شعراء کے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ کوئی بھی کرایہ قبول نہیں کریگا بارہ آنے تھرڈ کا۔ سوا روپیہ انٹر کا اور ڈیڑھ روپیہ سیکنڈ کا کون لے گا اور کون دے گا۔ لہذا سب کے سب شاعر جا رہے ہیں وہاں"

چھوٹے نواب بولے۔ بھائی میرے اگر مجھے اس کی خبر ہوتی تو میں تاریخ بڑھا دیتا۔ لیکن اب یہ غیر ممکن ہے۔ اور اگر لکھنؤ والے مشاعرہ میں نہ پہنچے تو میری بڑی سبکی اور بدنامی ہو گی"!

حکیم بولے " بدنامی ہو تمہارے دشمنوں کی۔ تم مجھے ایک بات بتا دو تمہیں مشہور شاعر چاہیں یا اچھے شاعر"

وہ بولے "بھیا مشہور شاعروں کا مجھے اچار تو ڈالنا نہیں ہے۔ آج کل ترنم کی دنیا ہے۔ شاعر چاہے مشہور ہو یا نہ ہو۔ اگر پڑھتا اچھا ہے تو مشاعرہ لے جاتا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے"

حکیم بدھن بولے "اگر یہ بات ہے تو بہترین پڑھنے والے اور بے مثل کہنے والے شعراء تم مجھ سے لے لو جتنے چاہیں"!

چھوٹے نواب اچھل پڑے اور بولے۔

"خدا تم کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ بھیا بدھن واللہ تم سمبت چھ

شاعر مل سکیں گے؟"

حکیم بڈھن نے کہا "ضرور مل جائیں گے، تم اطمینان رکھو"

چھوٹے نواب نے کہا "لیکن بھیا ایسے شاعر ہوں کہ مشاعرہ لوٹ لیں۔ ہم نے دور دور سے سامعین بلائے ہیں"

حکیم بڈھن نے کہا "میں گارنٹی دیتا ہوں۔ ایسے ہی شاعر ہوں گے"

چھوٹے نواب کا ہاتھ جیب میں گیا اور کچھ مٹھی میں دبائے ہوئے باہر آیا حکیم بڈھن سے وہ ہاتھ ملا اور جب واپس ہوا تو خالی تھا۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"بھائی چھوٹے نواب! تمہارے حکیم بڈھن کی جان بھی حاضر ہے۔ ہم لوگ انشاءاللہ جمعے ہی کو رات کے نو بجے تک تمہارے ہاں پہنچ لیں گے"

میں نے پہلی بار چھوٹے نواب کو مخاطب کیا اور کہا۔

"نواب صاحب! آپ سہیل کو جانتے ہیں؟"

وہ بولے "سہیل؟ بہزاد صاحب سہیل تو میرا سالا ہے۔ میری بیگم کا اکلوتا بھائی۔ اور اس مشاعرے کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے"

میں نے کہا "یہ تو بڑی خوشی ہوئی سنکر کہ آپ سہیل کے بہنوئی ہیں"

وہ بولے "اسی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اگر میں شعراء کے حصول میں ناکام ہو جاؤں تو حکیم بڈھن صاحب سے مل لوں۔ حکیم صاحب سے میری پرانی واقفیت یوں بھی تھی۔ میں تو آتا ہی"

چھوٹے نواب کے رخصت ہوتے ہی حکیم بڈھن نے مجھے چڑاتے ہوئے کہا۔

"اب تمہارا نازک قلب دھڑک رہا ہوگا کہ وہاں وہ رستم وقت سہیل موجود ہے اور مشاعرے کا اہتمام اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ مجھ کو پانی میں گھول کر پی لے گا۔"

میں نے کہا عقل مندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ جو بٹی کی دشمنی ہے یعنی خوف کھایا جائے چہ جائیکہ سہیل۔ وہ سہیل کا وطن بھی ہے ، اور سہیل وہاں سب کچھ کر سکتا ہے"

وہ مٹکتے ہوئے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے بولے۔

"اوفی اللہ یہ مردوں میں کیوں آئی ؟ یار بیٹھے رہو تم اپنا اختلاجی دل لئے ہوئے۔ حکیم بڈھن ایسے گیدڑوں کی بھبکی میں آنے والا نہیں ہے اور ہاں سنو۔ جلد کسی سے تانگا لے کر جاؤ اور بانکے مہتاب علی۔ چھٹن صاحب جعفا۔ آغا دلارے حزیں۔ جنون اسد وحشت کو یہ اطلاع دیدو کہ آج شام کو یہ حضرات میرے ساتھ یہاں چلئے نوش فرمائیں۔"

میں نے کہا۔ صبا حزیں۔ وحشت تو واقعی مترنم لوگ ہیں لیکن یہ بانکے مہتاب علی کی تم کو کیا سوجھی۔ لٹھ دار انداز سے شعر خوانی کرتے ہیں۔

وہ بولے۔ "محض تمہاری وحشت کی تسکین کے لئے لکھنؤ کا سب سے جیالا اور بہادر آدمی ہے۔ اسی لئے ساتھ چل رہا ہے کہ شاید (مجھے گھورکر) وہ رستم زماں سہیل مجھے کچا نہ چبا جائے۔"

میں حکیم بڈھن کے اس طنز سے جل ہی گیا۔ لیکن مجبور تھا۔ تانگا لے کر چلا گیا اور چاروں صاحبان کو شام کی دعوت دیکر چلا آیا۔

ٹھیک شام کے ۵ بجے صبا، وحشت اور حزیں چائے خانے پہنچ گئے۔

بانکے مہتاب علی کوئی دس منٹ دیر سے پہنچے۔

صبا، حزیں، اور وحشت ان تینوں کا ترنم بہت اچھا تھا خوب لہک کر پڑھتے تھے۔ کوئی چھ ماہ سے فیکٹری کے خریدار بن گئے تھے۔ یہ حضرات آج تک کسی بیرونی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ لہذا عرصے سے حکیم بدھن کے سر تھے کہ کسی بیرونی مشاعرے میں لے چلیئے۔ بانکے مہتاب علی واقعی بانکے تھے۔ ہاتھ میں ایک موٹا سا روغنی ڈنڈا ہمیشہ ساتھ رہتا تھا جس پر چاندی کی موٹھ چڑھی ہوئی تھی ان کا رعب اتنا تھا کہ شہر کا ہر غنڈا ان سے کانپتا رہتا تھا۔ خود شریف آدمی تھے ان کو حکیم بدھن نے ہی شاعر بنایا تھا۔ یہ اشعار تحت اللفظ پڑھتے تھے اور اس انداز سے پڑھتے تھے گویا لٹھ مار رہے ہوں۔ ان کی گرجدار آواز اور بھاری بھرکم پن سے مرعوب ہو کر لوگ مشاعرے میں کافی داد دیدیا کرتے تھے۔ یہ غریب بھی آج تک کسی بیرونی مشاعرے میں نہیں گئے تھے۔

بانکے مہتاب علی کے آتے ہی چائے کی پیالیاں گردش میں آگئیں۔ چائے نوشی کے دوران حکیم بدھن نے کہا۔

"میں نے آپ حضرات کو یوں زحمت دی ہے کہ ایک عظیم الشان مشاعرہ اسی ہفتے کو ہو رہا ہے"

ان چاروں کے چہرے امید و بیم کی حالت میں نظر آنے لگے۔

حکیم بدھن نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب مشاعرہ میرے پرانے دوست ہیں۔ میں نے تمام مشہور شعراء کے نام کٹوا کر آپ حضرات کو مدعو کرا دیا ہے!"

میں نے دیکھا ان چاروں کے چہرے کھل گئے۔ یکایک چشو نواب نزہت نے کہا۔

"اے تمہیں میری جان کی قسم حکیم صاحب کیا سچ کہہ رہے ہو"

حکیم بڈھن نے کہا "تمہاری جان کی قسم، میں جھوٹ بولنے والے کو کافر سمجھتا ہوں۔ ابھی پانچ دن روانگی میں باقی ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس کم از کم چار چار غزلیں ایسی تگڑی ہونا چاہیئیں کہ وہاں والے دنگ رہ جائیں اور انکے پڑھنے کی بھی مشق آپ حضرات کو میرے پاس روز آکر کرنا پڑے گی۔ وہاں علاوہ لکھنؤ کے ۔ گورکھپور، گونڈہ، بہرائچ اور جبدوں کے شعرائے کرام بھی آرہے ہیں"

صہبا نے کہا۔ "تو یہ کہو مشاعرہ واقعی بڑا معلوم ہوتا ہے"

حزیں بولے۔ "حکیم صاحب! اوروں کی میں نہیں کہہ سکتا۔ میں خصوصی طور پر آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ کی بدولت پہلی بار بیرونی مشاعرے میں جا رہا ہوں۔ میرے متعلق آپ کو کلی اختیار ہے۔ آپ غزلیں تیار کرا لیجیے۔ میں انشاءاللہ کل آکر نذرانہ پیش کر دوں گا"

حکیم نے کہا "اچھی بات ہے اور حضرات کیا ارشاد فرماتے ہیں"

بلبلے مہتاب علی بولے۔ "یار عجیب باتیں کرتے ہو۔ سب کے لئے چار چار غزلیں تیار رہنا چاہیئیں۔ اس میں رائے مشورے کی کیا بات ہے۔ ارے بھئی یہی تمہارا احسان کیا کم ہے کہ ہم لوگ تمہاری بدولت بیرونی مشاعرے میں پڑھ آئیں گے"

یہ پانچ دن بڑی گہماگہمی میں گزرے۔ چاروں شعرائے کرام ہر دو تین گھنٹوں کے بعد حکیم بڈھن کے پاس پہنچ لیتے تھے علاوہ مشق شعر خوانی کے لباس کے معاملے میں بھی حکیم بڈھن کی رائے لی جانے لگی۔ مجھے ان سولہ غزلوں کی تیاری کے، علاوہ یومیہ اجرت کے حکیم بڈھن نے پچاس روپے دیئے۔ جمعے کے دن صبح آٹھ بجے کی گاڑی پر آغا میر کی ڈیوڑھی سے اس قافلے کو روانہ ہونا تھا۔ میں صبح ۶ بجے گھر سے تیار ہو کر نکلا۔

گھر سے نکلتے وقت مجھے یہ خیال آیا کہ بچوں کے لئے گاڑھے کے تھان وہاں سے لیتا آؤں گا۔ اس کے لئے میں نے دس روپے اپنی جیب میں ڈال لئے اور سیدھا چائے خانے روانہ ہو گیا مجھے حیرت ہوئی کہ صبح ۶ بجے ہی سے چاروں شعرائے کرام چائے خانے میں ڈٹے ہوئے نظر آئے۔ سب کے ساتھ ایک ایک اٹیچی اور ہولڈال تھا۔ سب کے سب حکیم بڈھن کے نہ ہونے سے پریشان تھے۔ میں نے کہا۔

"گاڑی ساڑھے سات بجے جنکشن سے چل کر سٹی اسٹیشن پر پونے آٹھ بجے آتی ہے اور یہاں سے ٹھیک ۸ بجے چھوٹتی ہے۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں حکیم بڈھن اگر ساڑھے سات بجے بھی آ گئے تو مشکل سے دس منٹ کا راستہ ہے۔ گاڑی سے پہلے پہنچ لیں گے"

لیکن ان اشتیاق کے مارے شاعروں کو کسی طرح سے تسکین نہیں ہو رہی تھی۔

حکیم بڈھن ٹھیک پونے سات بجے چائے خانے پہنچے۔ حکیم بڈھن دولہا

بنے ہوئے تھے۔ جامدانی کا انگرکھا چنی ہوئی دوپلڑی ٹوپی، کسا ہوا چوڑی دار پاجامہ۔ اس پر سیاہ پمپ بہار دے رہا تھا۔ داہنے ہاتھ کی کلائی پر سنہری گھڑی سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"یار بہزاد نظر نہ لگا دینا"

میں نے کہا۔ تیل اور ماش تو اُتار کر ہی چھوڑوں گا۔

حکیم بڈھن نے بیٹھتے ہی ناشتے کا آرڈر دیا۔ سب لوگ تو مجھ سمیت ناشتہ کر ہی چکے تھے۔ حکیم بڈھن نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ شعرائے کرام روانگی کے لئے کروٹوں پر کروٹیں بدل رہے تھے لیکن مجبور تھے۔ گھڑی گھڑی گھڑیاں دیکھی جا رہی تھیں۔ یہانتک کہ ٹھیک ساڑھے سات بجے حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا۔

"بھیا بہزاد دو تانگے لے آؤ"

تانگا اسٹینڈ سامنے ہی تھا۔ محض ہاتھ کے اشارے سے دو تانگے آموجود ہوئے۔ سامان رکھا گیا۔ ایک تانگے پر صہبا، حزیں اور بلکے مہتا علی بیٹھے۔ دوسرے پر وحشت، میں اور حکیم بڈھن بیٹھ گئے۔

راستے میں، میں نے حکیم بڈھن سے کہا۔

"ریلوے یارڈ پر تانگہ سے اترتے ہی ٹکٹ خرید لوں"

وہ بولے۔ "نہیں ٹکٹوں کی حاجت نہیں ہے۔ اس گاڑی سے نقن گونڈے تک چل رہے ہیں"

میں خاموش ہو گیا۔ نقن ٹی ٹی تھے اور وہ بھی حکیم صاحب کے خریدار ظاہر امر ہے کہ اب ٹکٹوں کی کیا حاجت تھی؟

اسٹیشن پر پہنچتے ہی میں تو گھبرا گیا۔ اسٹیشن مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہندوؤں کی ایک بارات تھی جو اس گاڑی سے گونڈے جا رہی تھی۔ میں نے حکیم بدھن سے کہا۔

"بھیا بدھن۔ یہ گاڑی چھوڑ دو۔ دوپہر والی سے چلو۔ ورنہ اس رش میں تو سفر مصیبت ہو جائے گا۔"

حکیم بدھن بولے۔ "یار بہزاد تم اپنی اختلاجی کیفیت اپنے پاس ہی رکھو۔ سفر آخر سفر ہی ہوتا ہے۔ راحت نہ سہی تکلیف سہی۔ میں چھوٹے نواب سے کہہ چکا ہوں اسی گاڑی سے لکھنؤ میں جو گاڑی پہنچ جاتی ہے اس پر شعرائے کرام کے استقبال کے لئے جو لوگ آئیں گے ان کا کیا بنے گا۔"

میں خاموش ہو رہا۔ بات معقول تھی۔ ٹھیک پونے آٹھ بجے۔ بی۔ این ڈبلیو۔ آر کی گاڑی خراماں خراماں بستی اسٹیشن پر آ کر لگ گئی اور مسافر اس پر جھپٹ پڑے۔ اتنے میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے نقن ٹی ٹی حکیم صاحب کی طرف آتے ہوئے نظر آئے اور مجھ سے بولے۔

"بھیا بہزاد! آخری کمپارٹمنٹ گارڈ کے برابر والا، میں نے لاک کر دیا ہے یہ کنجی لو اور تم سب لوگ چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے نقن سے کنجی لے لی۔ حکیم بدھن قلیوں پر سامان لدوائے ہوئے آخری گاڑی کی طرف بڑھے۔ گارڈ سے ملا ہوا ڈبا واقعی لاک تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ آرام سے سامان اندر رکھا۔ اور تمام شعرائے کرام اطمینان سے بیٹھ گئے مسافروں کا سارا رش اگلے اور درمیانی درجوں کی طرف تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے

انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔ گاڑی بستی اور ڈالی گنج کے درمیان تھی کہ فٹ بورڈ پر چلتے ہوئے میاں نقن ڈبے میں وارد ہوئے۔

"حکیم صاحب معاف کیجئے گا۔ میں آپ سب کو انٹر یا کم از کم سکینڈ کلاس میں لے چلتا۔ لیکن اس کمبخت بارات نے سارے بڑے ڈبے اور تقریباً ساری تھرڈ کی بوگیاں ریزرو کرالی ہیں۔ بمشکل یہ ایک بوگی بچی ہے جس کے ایک ڈبے پر آپ قابض ہیں۔"

حکیم نے کہا۔ "یار کوئی بات نہیں۔ اس میں کیا قصور ہے تمہارا۔ بس اتنا کرو کہ اس میں کوئی اور مسافر نہ آسکے۔"

وہ بولا۔ "اس سے آپ اطمینان رکھیے۔"

ڈالی گنج کے بعد ہی شاعری شروع ہو گئی۔ حکیم صاحب نے گرینڈ ریہرسل شروع کر دی۔ پسنجر ٹرین تھی۔ گارڈ ہر اسٹیشن پہ اترتا اور چڑھتا رہتا تھا۔ میں نے چونکہ ریلوے کی ملازمت کی تھی۔ لہٰذا مجھے گارڈ کی نگاہوں سے یہ محسوس ہوا کہ وہ ہم لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ بارابنکی پہ جب نقن چیکنگ کرنے کے بعد ڈبے میں آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔

"یار نقن۔ کیا تم سے اور اس گارڈ سے کچھ ان بن ہے؟"

وہ بولے۔ "ایسی ویسی۔ اس کا تو بس نہیں ہے ورنہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے۔"

گاڑی تقریباً چار بجے جرول پہنچی۔ یہاں انجن کو پانی لینا تھا اس لئے گاڑی کو بیس منٹ ٹھہرنا تھا۔ میں شعرائے کرام کی نغمہ سرائی سے تنگ

آچکا تھا۔ پلیٹ فارم پر اترا اور ٹہلتا ہوا اسٹیشن کے برآمدے تک نکل گیا۔ میں نے دیکھا گارڈ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں کچھ باتیں تیز تیز کر رہا ہے میں جب اور نزدیک گیا تو دو الفاظ میرے کان میں پڑے۔۔ ڈبلو ٹی اور ٹیلیگرام، میرا دل دھڑکا۔ ایک تخیل میرے ذہن میں آیا اور میں سیدھا گیٹ کی طرف چلا گیا۔ ٹکٹ کلکٹر اسٹول پر بیٹھا ہوا جمع شدہ ٹکٹ گن رہا تھا۔ میں چپکے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں نے ٹکٹ گھر پر جا کر جرول سے گونڈہ تک کے چھ تھرڈ کلاس ٹکٹ خرید لیے۔ میں ریزگاری گن ہی رہا تھا کہ گارڈ ابھی سگنل دینے کے لیے گارڈ لائٹ لگنے کے لیے روانہ ہوا۔ میں بھی جلدی سے گیٹ پر پہنچا۔ ٹکٹ کلکٹر نے ٹکٹ مانگا۔ میں نے تازہ ٹکٹ خریدا ہوا دکھا دیا اور سیدھا ڈبے پر پہنچ گیا۔ میں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ گاڑی چل دی۔ حکیم بڑھن نے بڑے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کہاں تھے یار"

میں نے کہا۔ "ذرا ٹہل رہا تھا۔"

ان شعرائے کرام کے حلق تھے کہ مشینیں۔ کسی طرح تھکنے ہی نہ تھے گاڑی روانہ ہوتے ہی پھر شاعری شروع ہو گئی۔ میں نے تو کان بند کر لیے۔ گاڑی ٹھیک چھ بجے گونڈے پہنچی۔ نقن ایک اسٹیشن قبل ہی ڈبے میں آچکے تھے۔ کہ شعرائے کرام کو گیٹ سے باہر نکال دیں۔ گاڑی جوں ہی پلیٹ فارم پر پہنچی میں نے دیکھا کہ اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اسی ڈبے کی طرف بڑھا جس سے شعرائے کرام اتر رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کو دیکھتے ہی نقن کا چہرہ

اتر گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"بھائی بہزاد۔ بڑی چوٹ ہو گئی۔ کمبخت گارڈ نے غالباً تار کرا دیا۔ میری ملازمت کا دیکھو کیا حشر ہو۔ اور تم لوگوں سے جو شرمندگی ہو گی وہ تو ہو گی ہی"

سپرنٹنڈنٹ کو آتے دیکھ کر ٹرین گارڈ بھی اترا اور اس نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔

"یہ چھ مسافر بلا ٹکٹ ہیں جن کو نقی ٹی ٹی رشوت لے کر یہاں تک لائے ہیں"

ہم نے دیکھا کہ حکیم بڈھن بھی گھبرا گئے۔ شعرائے کرام کے چہرے بھی فق ہو گئے۔ سپرنٹنڈنٹ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہم نے کہا۔

"ان گارڈ صاحب کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم سب کے ٹکٹ موجود ہیں۔ یہ چھ ٹکٹ ملاحظہ فرمائیے۔ نقی پر غلط الزام ہے۔ وہ شاعر ہیں اور اکثر ہمارے پاس شعر سننے کے لئے آتے ہیں۔ رشوت کا کوئی معاملہ نہیں ہے"

سپرنٹنڈنٹ نے ٹکٹ لے کر دیکھے۔ تاریخ آج ہی کی تھی۔ اسی گاڑی کا ٹائم دیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹکٹ واپس دیتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ معاف کیجئے۔ آپ کے ٹکٹ صحیح ہیں اور گارڈ نے جو الزام آپ پر لگایا ہے۔ میں اس کے لئے آپ سے معافی کا طالب ہوں"

یہ کہہ کر وہ گارڈ اور نقی کو ساتھ لئے ہوئے چلا گیا۔ حکیم بڈھن نے مجھ سے کہا۔

"یار بہزاد تم نے کیا جادو کر دیا۔ میں تو گھبرا گیا تھا کہ آج عزت گئی"

میں نے کہا، "مجھے جو دل میں شبہ ہو گیا تھا۔ تم سے کہتا تو تم میرے اختلاجی دل والا معاملہ میرے منہ پر دے مارتے۔ میں نے جو کھیلا اور ٹکٹ خرید لیے۔ میرا خیال آخر صحیح نکلا۔"

حکیم بدھن نے کہا، "اللہ کرے سہیں کے معاملے میں صحیح نہ نکلے۔"

اس پلیٹ فارم سے بہرائچ کے پلیٹ فارم کے درمیان حکیم بدھن نے مجھے کئی بار گلے لگایا۔ اور بے حد ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھیا ذرا لپک کر سیکنڈ کلاس کے چھ ٹکٹ خرید لاؤ۔ سفر ہی کتنا ہے جو پیسا بچایا جائے۔ جب تک ہم لوگ ڈبے میں بیٹھ رہیں گے۔"

میں بکنگ آفس روانہ ہو گیا۔ جب ٹکٹ لے کر پلٹا، اور ٹرین پر پہنچا تو شعرائے کرام سیکنڈ کلاس میں بہ ہزار شان داد جلوہ فرما تھے، اور کمبخت شعر خوانی جاری تھی۔ میں حیرت میں تھا کہ ان لوگوں کے حلق مشین ہیں یا کسی اور شے کے بنے ہوئے ہیں کہ صبح آٹھ بجے سے اس وقت تک شعر خوانی ہی کر رہے تھے اور تھکان کا نام نہ تھا۔ میں سخت کوفت کے باعث پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اور گاڑی چھوٹنے کے بعد ڈبے میں آیا۔ جب میں ڈبے میں داخل ہوا تو بھائی بانکے مہتاب علی اپنے لکڑ توڑ انداز سے غزل سرا تھے۔ میری کوفت اور بڑھ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا اور ریل کی چھک چھک میں محو ہو گیا۔

خدا خدا کر کے ایک گھنٹے کا سفر بخیر و خوبی تمام ہوا۔ منزل مقصود (چھوٹا لکھنؤ) کے اسٹیشن پر لکھنوی لباس میں ملبوس متعدد حضرات پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ جن میں بے حد نمایاں چھوٹے نواب اور سہیں تھے۔ گاڑی رکتے ہی

پہلے تو چھوٹے نواب حکیم بدھن سے بغلگیر ہوئے اس کے بعد سہیل نے حکیم بدھن کو بری طرح بھینچ لیا۔ میں سہیل کے اس بدلے ہوئے انداز سے اور مشکوک ہوگیا تمام شعرائے کرام کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ صرف میں ہی نظرانداز کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ میرے جیسے لباس والے افلاس زدہ انسان کو کیونکر قابل التفات سمجھا جا سکتا تھا۔ قلیوں نے سامان اُٹھایا اور اسٹیشن سے باہر آئے۔ باہر کئی تانگے مہمانوں کے واسطے مخصوص تھے جن پر مہمان اور میزبان صاحبان بیٹھنا شروع ہو گئے۔ حکیم بدھن چھوٹے نواب اور سہیل کے ہمراہ بیٹھے اور مہمانوں میں صرف میں رہ گیا جس کو ایک خالی تانگے پہ بیٹھنا پڑا۔ میزبان صاحبان سب کے سب اور شعرائے کرام کے ساتھ بیٹھ چکے تھے۔ تانگا چلتے ہی تانگے والے نے کہا۔

میاں مجھے پہچانا۔؟"

میں نے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ "نہیں بھائی"

وہ بولا۔" ارے میاں فضلو کا لڑکا گھسیٹا ہوں۔ آپ کے مکان کے بالکل سامنے والے احاطے میں رہتا تھا۔ پانچ برس ہوئے میری شادی یہاں ہوگئی اور میں یہیں کا ہو رہا۔ اور یہیں تانگا جوتنا شروع کر دیا۔ میرے والد کے تانگے میں تو آپ اکثر بیٹھے ہیں!!

میں نے اور بغور دیکھا تو اس کے نقوش مجھے آشنا نظر آئے۔ پانچ برس پہلے یہ لڑکا سا ہوگا اب تو کڑیل جوان تھا۔ میں نے کہا۔

"ارے تم گھسیٹے ہو!!

وہ بولا۔ ہاں میاں۔ ایک حضور کو میرے گھر والی روٹی کھانی پڑے گی۔

ہیں اس کے بغیر جانے نہ دونگا۔ آدمی غریب ہوں۔"

"میں نے کہا۔ نہیں بھیا۔ میں ضرور تمہارے کھانا کھاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔"

اس نے کہا۔ "بھیا ایک بات آپ کو بتا دوں۔ آپ میرے وطنی ہیں۔ جہاں آپ لوگ ٹھہرائے جارہے ہیں اور چل رہے ہیں۔ یہ ایک پرانی کوٹھی ہے لیکن اس میں بھوت رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بھوت کیا کہہ رہے ہو تم؟"

وہ بولا۔ "میاں اصل میں یہ کوٹھی کوئی پچاس برس ہوئے ایک انگریز کے لئے بنوائی گئی تھی۔ ایک دن وہ بیچ کے ہال میں مرا ہوا ملا۔ کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ اس دن کے بعد اس کوٹھی کے بیچ کے ہال میں اس کا بھوت نظر آنے لگا۔ لہٰذا بیچ کا ہال بند کر دیا گیا۔ اور کمروں میں مہمان ٹھہرائے جانے لگے اور اب اس کوٹھی کی حیثیت مہمان خانے کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اور کسی کمرے میں بھوت کسی کو نظر نہیں آتا کیا؟"

وہ بولا۔ "جی نہیں۔ مہمان ہر ابھی ہمیں ٹھہرتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا۔ بیچ کے کمرے میں دو ایک مہمان ضد کر کے ٹھہرے تو وہ صبح کو بیہوش ملے۔ ان کا بیان تھا کہ انہیں اس کمرے میں انگریز کا بھوت نظر آیا جو زمین پر کچھ تلاش کر رہا تھا اور اس کا کٹا ہوا گلا بہ ابھی تک نظر آرہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "اور کوئی بات؟"

وہ بولا۔ "جی نہیں۔ میں نے آپ کو ہوشیار کر دیا ہے کہ بیچ کے ہال میں آپ

آپ بھولے سے کبھی نہ جایئے گا!"

اتنے میں کوٹھی آگئی۔ کوٹھی کا باغ خاصا پھولوں سے لدا ہوا سرسبز نظر آرہا تھا۔ کوٹھی میں متعدد گیس کے ہنڈے روشن تھے۔ شعرائے کرام یکے بعد دیگرے اتار اتار کر ایک بغلی کمرے میں لے جائے گئے۔ جہاں متعدد پرانے قسم کے کوچ اور آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کئی سماوار پانی سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ جن کے برابر پیتل کے لوٹے، صابن دانیاں اور منجن دانیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شعرائے کرام فوراً چلمچی میں مشغول ہوگئے۔ میں تانگے والے کے بیان سے بہت متاثر تھا۔ میں نے کوٹھی کی دیکھ بھال شروع کردی۔ اسی بغلی کمرے سے ملے ہوئے ایک کمرے میں فرش بچھا ہوا تھا جس پر خالی دسترخوان اچھے سے لگا ہوا تھا۔ ان دونوں کمروں سے ملے ہوئے بیچ کے ہال میں تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گیس کے ہنڈوں کی روشنی میں چھ نواڑ کی پلنگ اس ہال میں بچھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ جن پر دو ملازم شعرائے کرام کے ہولڈال کھول کھول کر بستر بچھانے میں مشغول تھے۔ ہر پلنگ کے نیچے ایک ایک سوٹ کیس بھی ملازمین نے اس اثنا میں لگا دیا تھا۔ اس ہال کے دوسری جانب بھی دو کمرے تھے لیکن وہ مقفل تھے بیچ کے ہال کے متعلق گھیٹا مجھے جو سنا چکا تھا وہ میرے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا۔ شعرائے کرام کی خوابگاہ اس کمرے میں ہونے کے معنی ظاہر تھے شرارت تھی۔ لیکن میں حکیم بدھن کو بتلاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ میری بات کو میرے وہم اور اختلاج پر مبنی سمجھ لیتے تھے۔ لیکن میرا دل بے چین تھا اس اثنا میں شعرائے کرام منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ نئے لباس ابھی

بدلے جا چکے تھے۔ میں جب گھوم گھام کر پہنچا تو چائے آ چکی تھی۔ سہیل حکیم بدھن پر بپھا ہوا جا رہا تھا۔ کہیں سے کہیں تک اس کا پتا نہیں چلتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ چائے نوشی کے دوران حکیم بدھن کے لطائف نے میزبانوں کو ہنسا ہنسا کر مار ڈالنا شروع کر دیا۔۔۔ میں بھی چائے کے دوران خاموشی سے موقع کا انتظار کرتا رہا۔ کھانے میں ابھی کافی دیر تھی۔ چائے کے خاتمے پر حکیم بدھن نے کہا

"حکیم صاحب مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔۔ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا علیحدہ تشریف لے آئیے"

میرے اس انداز تخاطب سے حکیم بدھن کچھ سمجھے اور بولے۔

"میں ابھی چل رہا ہوں۔ آپ حضرات مجھے اجازت دیں۔ بھائی بہزاد کو کچھ مجھ سے کہنا ہے"

میں حکیم کو لیکر پائیں باغ کے ایک گوشے میں چلا گیا اور میں نے کھٹیا کا بیان کیا ہوا سارا حال سنا دیا۔ حکیم بدھن خاموشی سے میری بات سنتے رہے اور بولے۔

"بھیا بہزاد جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ تم سے کہہ دوں کہ تم اپنی اختلاجی باتوں اور وہم کو اپنے پاس ہی رکھو۔ لیکن تمہاری آج صبح کی سوجھ بوجھ کو دیکھ کر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ استاد باوجود مدہوشی کے تم باہوش ہو۔ دوسرے یہ کہ سہیل کے بدلے ہوئے انداز پر بھی شبہ کیا جا سکتا ہے۔ تمہارے تلنگے والے کے بیان کو سہیل کے انداز سے اور بھی تقویت پہنچ رہی ہے لی

میں نے کہا۔ پھر کیا سوچا ہے؟

وہ بولے۔ یار سوچا کیا ہے۔۔ وحشت، صبا، حزیں تو ہمیں لوگ ہیں بھوت کے ذکر سے ڈر جائیں گے۔ چہ جائیکہ سابقہ رہے۔ بانکے مہتاب علی یہ یوں تو بڑے بارعب اور بہادر ہیں۔ لیکن بھوت کے سامنے نہیں کہا جا سکتا۔"

میں نے چونک کر کہا۔" مطلب پر بھی آؤ۔ یہ تمہید کیوں گانٹھ رہے ہو۔"

وہ بولے۔ تمہید یوں ہے کہ بقول تمہارے ایک کمرے میں دستر خوان بچھا ہے اور وہ کمرہ حسب بیان محفوظ ہے۔ لہذا ان چاروں کو اس میں سلا دیا جائے میں اور تم ان صاحب بہادر کو بھگت لیں۔"

میں نے کہا۔" کیا مطلب ہے تمہارا۔"

وہ بولے۔" بھیا تم کو معلوم ہے کہ میرے پاس ایک ایسا تعویز ہے کہ بھوت پریت اور جن مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا اور تم نمازی آدمی ہو یقینی حصار کرنا جانتے ہو گے۔ لہذا میں اور تم اسی بیچ کے کمرے میں رات گزاریں اور حقیقت دیکھ لیں گے۔"

میں نے کہا۔" اور اگر کوئی مشکل آ پڑی۔"

وہ بولے۔" تخته کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا بھاگ لیں گے۔"

اس گفتگو کے بعد ہم لوگ جب کمرہ نشست میں پہنچے تو بھائی بانکے مہتاب علی اپنی بہادری کا ایک واقعہ سنا رہے تھے۔ اور تمام میزبان حضرات بغور سن رہے تھے۔ بانکے مہتاب علی کا واقعہ سچ ہو یا جھوٹ تھا دلچسپ۔ تقریباً ایک

گھنٹا اسی دلچسپی میں گزر گیا یہاں تک کہ دس بجے کا گجر بجا۔ سہیل نے کہا۔

"آپ حضرات ما حضر تناول فرمالیں"

برابر کے اسی کمرے میں جہاں پہلے سے دسترخوان بچھا ہوا تھا متعدد اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ سب لوگ بیٹھ گئے۔ کھانا واقعی پر تکلف تھا۔ کھانے پر بھی حکیم بدھن کے لطائف چلتے رہے۔ سب لوگ ضرورت سے زیادہ کھا گئے۔ کھانے کے بعد دسترخوان اٹھا اور اسی کمرے میں زمینی نشست شروع ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جنونواب وحشت کو بھی دعوائے بہادری ہے کھانے کے انہوں نے اپنا ایک واقعہ شروع کر دیا جس میں انہوں نے ایک شیر اور ایک بڑے سانپ کے شکار کا عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ ان دونوں کا شکار ان دونوں نے پیدل ہی کیا تھا۔ انہوں نے یہ داستان اس تفصیل کے ساتھ سنائی کہ ہر شخص متاثر نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ساڑھے گیارہ کا گجر بجا اور سہیل نے کہا۔

"بھائی حکیم صاحب! آپ سب حضرات کے لیے بستر بیچ کے ہال میں بچھا دیئے گئے ہیں۔ اب آپ حضرات کو آرام فرمائیں۔ دن بھر کی تکان کے بعد آپ حضرات کو آرام کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم سب لوگوں نے آپ کو اس وقت تک بے آرام رکھا جس کی ہم لوگ معافی چاہتے ہیں"

پونے بارہ بج رہے تھے جب شعرائے کرام بیچ کے کمرے میں سونے کے لیے پہنچے۔ یکایک حکیم بدھن نے کہا۔

"آپ حضرات مجھے یہ بتائیں کہ آیا آپ لوگوں نے کبھی بھوت دیکھا ہے یا نہیں۔"

صبا نے کہا "حکیم صاحب! آخر اس آدھی رات کے وقت اس گفتگو کا کیا موقع ہے۔ سونے بھی دو گے یا نہیں؟"

حکیم بڈھن بولے۔ "آپ حضرات یقیناً سو ہی گے۔ لیکن میں ایک بات گوش گزار کر دوں۔ یہ کمرہ جس میں ہم سب اس وقت موجود ہیں آسیب زدہ ہے اور مجھے اس کا کامل یقین ہے۔"

حزیں بولے۔ "یار کیوں ڈرا رہے ہو۔ کوئی اور ذکر چھیڑ دو۔"

حکیم نے کہا "بھائی مجھے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر آپ حضرات واقعی بھوت سے خائف نہ ہوں تو اس کمرے میں آرام فرمائیں ورنہ جس کمرے میں کھانا کھایا ہے وہاں میں پلنگ پہنچائے دیتا ہوں اس پر سو رہیے۔"

وحشت بولے۔ "اور تم حکیم صاحب؟"

حکیم بڈھن نے کہا "میں اور بہزاد یہیں رہیں گے ہمیں بھوت سے ملنا ہے" بھوت کے ذکر سے میں نے دیکھا کہ تمام شعراء کے چہرے فق تھے حتیٰ کہ چند لمحوں پہلے وحشت صاحب جنہوں نے پیادہ شیر اور اژدہے کا شکار کیا تھا وہ بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"جلدی سے طے کیجئے۔ ایسا نہ ہو بارہ بج جائیں۔"

بغیر کسی جواب کے شعرائے کرام نے اپنے بستر لپیٹے۔ پہلے بستر

کھانے والے کمرے میں پہنچائے پھر سب نے پلنگ پہنچانا شروع کر دیئے حکیم بڈھن نے کہا۔

"بھائی بلنکے صاحب آپ بہادر آدمی ہیں۔ آپ چاہیں تو اسی کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں"

میں نے دیکھا بلنکے مہتاب علی کا چہرہ خوف سے عجیب سا ہو رہا تھا وہ بولے۔

"بھیا میں بھی انہی حضرات کے ساتھ وہاں رہوں گا ورنہ یہ تینوں حضرات میرے بغیر ڈریں گے"

بات معقول تھی۔ بارہ کا گجر بج رہا تھا جب حکیم نے اپنے اوپر کچھ دم کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بھیا بہزاد تم بھی اپنے اوپر دم کر لو"

میں پہلے ہی دم کر چکا تھا۔ حکیم صاحب بستر پر اور میں کھری نواڑ پر لیٹ گیا"

یکایک کمرے میں بے پناہ گرمی بڑھنا شروع ہوئی اور کمرے میں جلتا ہوا گیس کا ہنڈا آپ ہی آپ بجھ گیا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ حکیم بڈھن نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بہزاد میرے پلنگ پر آ جاؤ"

میں پلنگ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک جانب سے ایک ہلکی ہلکی روشنی پھوٹی جس میں ایک انگریز نظر آیا جو سر برہنہ تھا۔ اور سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا

اس کا گلا نصف سے کم کٹا ہوا تھا۔ اور خون کے قطرے اس کے زخموں سے ٹپکتے ہوئے اس کے کپڑوں پر گر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے چلتا ہوا آیا اور بیچ کے کمرے میں کھڑا ہو گیا پھر وہ جھکا اور زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

اس نے ہم دونوں سے کوئی مخاطبت نہ کی۔ وہ کمرے کے ایک ایک کونے کھدرے اور فرش پر جھک جھک کر کچھ تلاش کرتا رہا۔ یکایک حکیم بدھن اس کی طرف بڑھے اور اس سے مخاطب ہوئے۔

WHAT ARE YOU SEARCHING HERE?

(تم یہاں کیا تلاش کر رہے ہو؟)

اس نے بغیر مڑے ہوئے جواب دیا۔

MY BIBLE (اپنا بائبل)

حکیم بدھن نے کہا۔

YOU PLEASE GO I WILL TRY TO SEARCH IT FOR YOU— PLEASE COME DAY AFTER TOMORROW.

(مہربانی کر کے تم جاؤ۔ میں تلاش کروں گا۔ تم پرسوں آنا۔)

انگریز پہلی بار حکیم بدھن کی طرف مڑا اور بولا۔

THANK YOU (شکریہ)

جدھر سے بھوت آیا تھا اسی طرف جا کر غائب ہو گیا۔ وہ روشنی بھی ختم ہو گئی۔ حکیم بدھن نے گیس کے ہنڈے کو ماچس سے جلا کر دوبارہ روشن کیا۔ کمرہ پھر روشن ہو گیا۔ شہر سے گجر کی آواز آئی۔ ایک حکیم بدھن نے کہا۔

"آپ حضرات اب اس کمرے میں آسکتے ہیں۔ بھوت جاچکا ہے"
بلکہ نیچے مہتاب علی کی ڈری ڈاری آواز آئی۔
"ہم لوگ یہیں سوئیں گے۔ تم بھی آجاؤ نا یہیں"
حکیم بدھن بولے۔ میں کیا کروں گا آکر، کیا سب لوگ سو گئے؟"
وحشت کی کپکپاتی ہوئی آواز آئی۔
"نہیں نہیں سب جاگ رہے ہیں ہم سب نے بھوت کو صاف دیکھا ہے"
حکیم نے کہا۔ اب آپ لوگ سو جائیں۔ اب کوئی خدشہ نہیں لیکن صبح اس واقعے کا ذکر آپ حضرات کسی سے نہیں کریں گے۔ میری تاکید ہے ورنہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے تعلقات ختم ہو جائیں گے"
۲ بجے میں سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو سہیل بیڈ ٹی لئے موجود تھے شعرائے کرام نے کلیاں کر کے چائے پی۔ آٹھ بجے ناشتہ آگیا۔ ناشتہ بھی بے حد پر تکلف تھا۔ حکیم بدھن دوبارہ شہر والوں کے گھیرے میں آگئے اور ان کے لطیفے شروع ہو گئے۔ دوپہر سے گورکھپور۔ بستی، گونڈہ اور جرول روڈ کے شعرا یکے بعد دیگرے آنا شروع ہو گئے جن کے قیام کے لئے دو بند کمرے کھول دیئے گئے۔ دوپہر کے کھانے پر مہمان شعرا کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا دوپہر کا کھانا بھی خاصا تھا۔ دوپہر کے بعد اسی کوٹھی کے پائیں باغ میں مشاعرے کا پنڈال آراستہ ہونا شروع ہو گیا۔ کھانے کے بعد شعرائے کرام شب بیداری کے خیال سے سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میں بھی سو رہا۔ شام

کی چائے پر اچھا خاصا مجمع شہر والوں کا بھی شریک ہوا۔ شام کے آٹھ بجے سے سامعین پنڈال میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ شعرائے کرام کو ٹھیک آٹھ بجے کھانا دیا گیا۔ واقعی پر تکلف ضیافت تھی۔ اس وقت تک حکیم بڈھن میر محفل بنے ہوئے تھے۔ بیرونی شعرا بھی حکیم بڈھن کے حلقہ بگوش نظر آنے لگے ان بیرونی شعراء میں سے کوئی بھی مشہور نہیں تھا۔ غالباً چھوٹے نواب نے تعلقات پر احباب کو مدعو کر لیا تھا۔

مشاعرہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی جب شعرائے کرام پہنچے۔ صرف سامنے کا وہ حلقہ خالی تھا جو شعراء کے لئے مخصوص تھا۔ ایک چوکی پر مسند بچھی ہوئی تھی اور درمیان میں ایک گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ سکریٹری کے فرائض سہیل کے ذمے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں شعراء کی ایک طویل فہرست لئے ہوئے، ٹھیک نو بجے چوکی پر پہنچے اور انہوں نے کہا۔

"حضرات اس محفل مشاعرہ کی صدارت کے لئے میں اپنے مہمان خصوصی عالی جناب حکیم بڈھن صاحب موہانی کا نام نامی تجویز کرتا ہوں"

چھوٹے نواب نے اٹھ کر تائید کی۔ حکیم بڈھن مسکراتے ہوئے صف شعراء سے آگے اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ میزبانوں کی طرف سے گجرے اور ہار گجرے ان کے گلے میں پڑنا شروع ہو گئے اور سامعین نے تالیوں کے شور سے محفل کو گرما دیا۔ تالیاں بجتے ہی سہیل نے ایک مقامی شاعر کو آواز دی۔ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ مشاعرے کے سامعین واقعی صاحب ذوق تھے۔ دل کھول کھول کر داد دینے لگے کچھ بعد

دیگر بے تقریباً دس مقامی شعرا پڑھے اور سب کے سب داد لے کر گئے۔ اب مہمان شعرا کی باری آئی۔ تقریباً سب کی غزلیں کامیاب رہیں۔ چار بج رہے تھے جب لکھنوی شعرا میں سب سے پہلے صبا کو پکارا گیا ظالم بے مثل پڑھتا تھا۔ محفل پر ایسا چھایا کر رہے نام اللہ کا۔ پھر حزیں کی باری آئی۔ اچھا پڑھتا تھا۔ چلا لیکن صبا کے رنگ کو نہ پا سکا۔ اب وحشت کی باری آئی۔ یہ پورے گویے تھے۔ بھیرویں کی دھن میں انہوں نے غزل شروع کی۔ اور غزل کے ساتھ ہی گائیکی کا کمال دکھانا شروع کیا۔ مشاعرہ جھوم جھوم گیا۔ اب باری آئی بانکے مہتاب علی کی۔ بانکے نے اپنی گرجدار آواز میں اشعار پڑھنا شروع کیے رعب دار آدمی تھا۔ لہذا غزل خوب چمکی۔ آخر میں باری تھی مجھ حقیر فقیر کی۔ میں پڑھا اور خدا جانے کیا بات تھی کہ مشاعرہ داد دیتے دیتے بے حال ہو گیا۔ مجھ سے تابڑ توڑ دو غزلیں اور سنی گئیں۔

مشاعرے کے خاتمے پر حکیم بدھن تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ حکیم بدھن نے پہلے تو اپنے انتخاب پر شکریہ ادا کیا اور پھر اہل شہر کی مہمان نوازی کا بے حد اعتراف کیا اور سب سے آخر میں کہا۔

"حضرات! آج رات کو ایک مختصر نشست اسی کوٹھی کے درمیانی ہال میں منعقد ہو گی جس میں مجھے امید ہے کہ آپ سب حضرات ضرور شرکت فرمائیں گے۔"

رات بھر کی جاگ نے اتنا خستہ کر دیا تھا کہ میں کھڑے پلنگ... پر کر گئی

لیٹ کر سو گیا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے جگایا گیا تو میں نے دیکھا اور بیرونی شعرا سب کے سب رخصت ہو چکے ہیں اور صرف ہم ہی لوگ باقی ہیں۔ کھانے پر سہیل موجود نہیں تھے وہ شعرائے کرام کو رخصت کرنے اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ کھانے کے دوران میں حکیم بڈھن نے چھوٹے نواب سے پوچھا۔

"بھیا۔ کیا اس کوٹھی میں کبھی کوئی انگریز قتل ہوا تھا"

وہ بولے "ہاں کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے"

حکیم بڈھن نے پوچھا۔ "اس کا کوئی سامان تو اب باقی نہ ہوگا"

نواب بولے "ایک کوٹھری میں اس کا سب سامان جب ہی سے بند پڑا ہوا ہے۔ اس وقت ریاست کی طرف سے اس کا سامان رکھ لیا گیا تھا کہ کوئی وارث آئے تو دیدیا جائے۔ یہ کوٹھی سہیل کے دادا کی تحویل میں ان کے بعد سہیل کے والد نگراں رہے اب سہیل ہیں"

حکیم بڈھن نے کہا "وہ سامان ہے؟"

وہ بولے "مالی کی کوٹھری کی برابر والی کوٹھری میں بند پڑا ہے۔ خدا جانے کیا ہے۔ میں نے تو آج تک دیکھا نہیں اور غالباً وہ کوٹھری آج تک کھلی ہی نہیں ہے"

کھانے کے بعد میزبان صاحبان ہم لوگوں کو دوپہر میں آرام کرنے کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی حکیم بڈھن نے کہا۔

"یار بہزاد میرے ساتھ چلو مجھے اس کوٹھری میں سامان دیکھنا ہے"

میں ساتھ ہو لیا۔ باغ کے آخری سرے پہ مالی کی کوٹھری تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور کوٹھری تھی جس پر ایک زنگ زدہ قفل لگا ہوا تھا۔ کوٹھی میں سوائے شہزاد کے اور کوئی نہ تھا۔ حکیم بڈھن نے ایک اینٹ لے کر قفل پہ دو ہی ضربیں لگائی تھیں کہ قفل کھل گیا۔ حکیم نے قفل کو زنجیر سے باہر نکالنے کے بعد زنجیر کھول دی۔ اور مجھ سے بولے۔

"میں دروازہ کھولتا ہوں"

میں نے کہا۔ "یار کہیں اندر سانپ نہ ہو"

وہ بولے۔ "اجی تم جانتے ہو کہ سانپ کا مجھ سے بڑا عامل شاید ہی کوئی ہو۔ میں اس کیڑے سے کب ڈرتا ہوں"

دروازہ بمشکل کھلا۔ تھوڑی دیر بند ہوا کے نکل جانے کے بعد حکیم بڈھن اندر داخل ہوئے۔ میں باہر ہی رکا رہا۔ چھوٹی سی کوٹھری میں ایک طرف ایک پرانے قسم کے چمڑے کا بکس رکھا تھا اور ایک بنڈل اس انداز سے بندھا ہوا تھا گویا اس میں کپڑے ہوں۔ حکیم بڈھن نے چمڑے کا بکس کھولا۔ اوپر ہی ایک مجلد کتاب رکھی ہوئی تھی۔ حکیم نے وہ کتاب اٹھا کر کھولی۔ سرِ ورق پر ہی لفظ بائبل دیکھ کر اس نے کتاب لے لی اور کہا۔

"کام ہو گیا بہزاد! ذرا یہ بائبل تھامو۔ میں یہ دروازہ پھر سے مقفل کر دوں"

میں نے بائبل ہاتھ میں لے لی۔ حکیم بڈھن نے دروازہ بند کیا۔ زنجیر چڑھائی اور قفل اٹکا دیا۔ اتفاقاً بائبل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری۔

اور اس میں سے ایک فوٹو نکل کر علیحدہ گیا۔ میں نے وہ فوٹو دیکھا۔ فوٹو کسی میم کا تھا جو سمندر کے کنارے کھڑی تھی اور اس کے لمبے لمبے بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔ میں نے وہ فوٹو حکیم بڈھن کو دکھایا انہوں نے وہ فوٹو مجھ سے لے کر پھر کتاب میں رکھ دیا اور واپس کوٹھی آگئے۔

شام ہی سے سامعین کی آمد شروع ہو گئی۔ چھوٹے نواب نے عام اعلان کو ختم کرنے کے بعد مخصوص حسین شہر کو دعوت دے دی تھی نیچے کے ہال میں دری چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ ایک جانب مسند بچھا دی گئی۔ ہم شعرائے کرام ساڑھے آٹھ بجے تک کھانے سے فارغ ہو گئے۔

مشاعرہ ٹھیک نو بجے شروع ہوا۔ پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ مقامی شعرائے کرام نے اچھی اچھی غزلیں پڑھیں اور خوب خوب داد حاصل کی۔ یہاں تک کہ سہیل کی باری آئی۔ سہیل نے مطلع پڑھا۔ وہ بہت اچھا کہتا تھا۔ چہار جانب داد کا شور بلند ہوا۔ اتنے میں شہر کے گجرے نے بارہ بجائے۔ سہیل نے پہلا مصرعہ پڑھا ہی تھا کہ گرم ہوا کا ایک جھونکا کمرے بھر کو گرما گیا۔ ہال میں روشن چار ہنڈے آپ ہی آپ بجھ گئے۔ چہار جانب تاریکی پھیل گئی۔ اور ایک طرف سے دھیمی ہلکی روشنی رونما ہوئی اور دبی گردن کا بھوت کمرے میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اسے دیکھ دیکھ کر چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ کمرے میں بھگدڑ مچ گئی۔ سہیل کا سب سے برا حال تھا اس کی مسلسل گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ چھوٹے نواب کی مارے خوف کے

آنکھیں نکلی آرہی تھیں ۔ بھوت حکیم بدھن کے پاس آیا اور بولا ۔

HAVE YOU GOT MY BIBLE-?

(تمہیں میری بائبل مل گئی)

حکیم بدھن نے کہا۔

(ہاں) YES

یہ کہہ کر حکیم بدھن نے وہ بائبل بھوت کے ہاتھ میں دیدی ۔ اس نے بائبل کھول کر اس فوٹو کو نکالا ۔ دیکھا اور مسکرا کر کہا ۔

I THANK YOU VERY MOCH NOW MY SOUL WILL RAST IN PEASE.

(بہت بہت شکریہ! اب میری روح سکون میں رہے گی)

یہ کہتے ہی وہ بھوت غائب ہو گیا ۔ روشنی بھی ختم ہو گئی ۔ اور اس گرمی کے اثرات بھی دور ہو گئے ۔

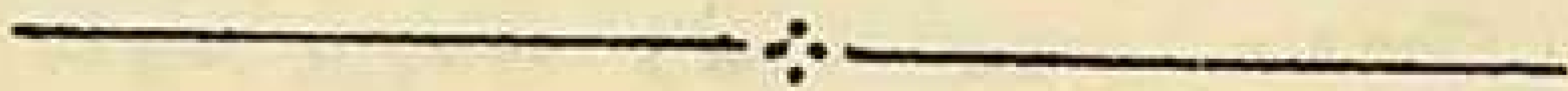
حکیم بدھن نے بڑھ کر ہنڈے روشن کئے ۔ سامعین کچھ تو بھاگ لئے تھے اور جو موجود تھے وہ سب کے سب بیحد خوفزدہ تھے ۔ سہیل کا مارے خوف کے سب سے برا حال تھا ۔ اب مشاعرہ تو کیا ہوتا تھا! روشنی ہوتے ہی سارے سامعین اڑ لئے ۔ سہیل کو بکڑ کر بمشکل اس کے گھر پہنچا گیا ۔ اس کوٹھی میں سوائے ہم چھ آدمیوں کے اور کوئی نہ رہا ۔

دوسرے دن صبح چھوٹے نواب جب ناشتے کے ساتھ آئے تو

ان کے ہاتھ رومال سے بندھے ہوئے تھے۔ حکیم بدھن نے ان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول کر ان کو گلے سے لگا لیا۔ چھوٹے نواب بولے۔

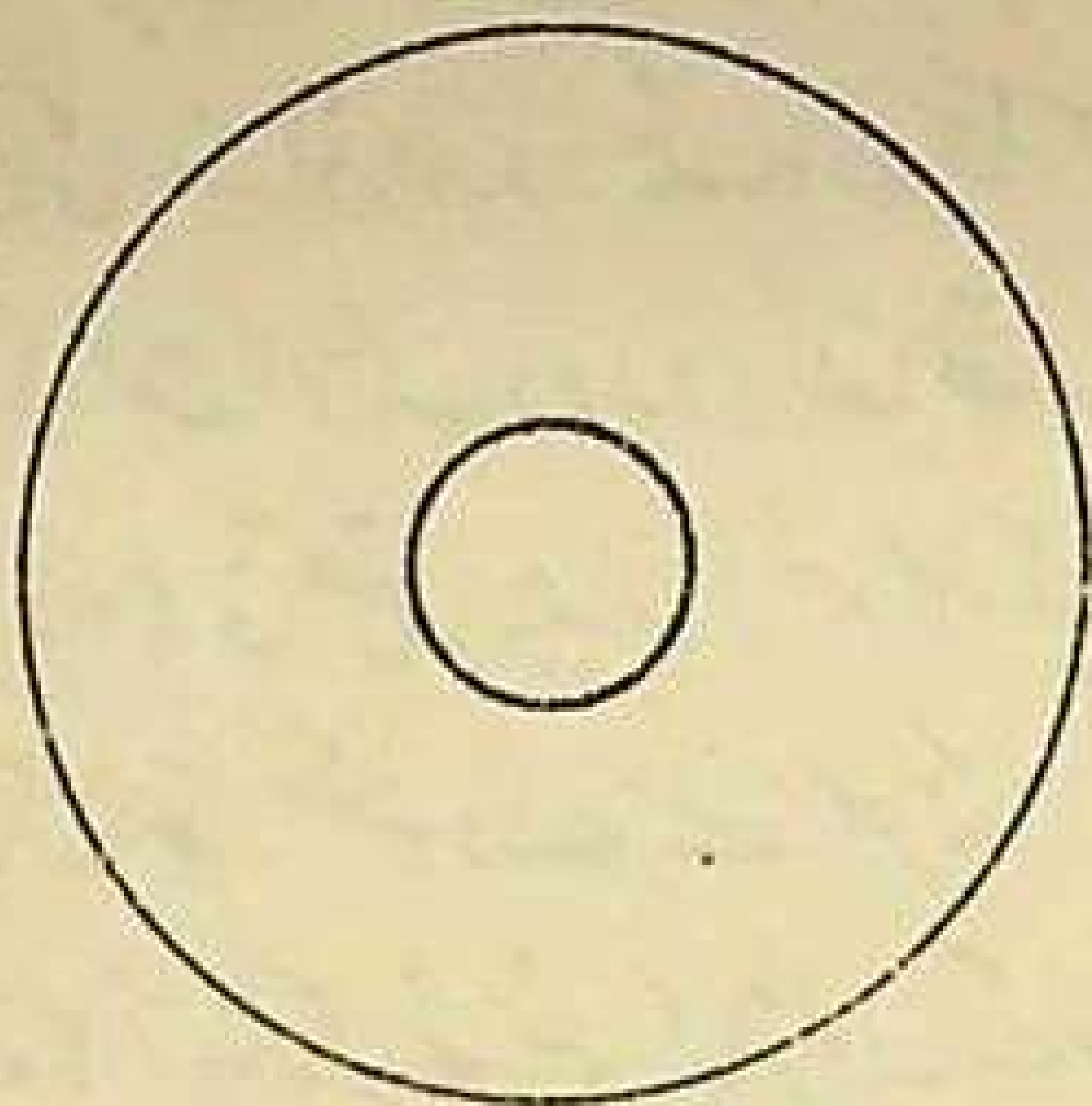
"بھیا بدھن یہ سارا فساد کمبخت سہیل کا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ کوٹھی بھوتوں سے پاک ہو چکی ہے۔ اور اسی نے تم لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے اس بیچ کے ہال کا انتظام کیا تھا"

حکیم بدھن نے کہا۔ "اس سے کہہ دیجیے گا کہ جو جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے"



ٹھاکر کی دلہن

حکیم صاحب کے قابو میں



وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رخسار کی باتیں کریں

تو جناب میں جوانی تک اسی نصیحت پر کاربند رہا ہوں۔ اب بڑھاپے میں اس نصیحت کو بھول گیا ہوں۔ تو جناب اس نصیحت پر اس شغف کے ساتھ کاربند تھا کہ سوائے ان باتوں کے اور کوئی بات کرتا ہی نہ تھا۔ صبح ۶ بجے سے رات کے ۸ بجے تک حسنِ یار اور زلف و رخسار کی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ زبان سے نہ سہی قلم سے سہی۔ فیکٹری میں ان دنوں بڑی گھما گھمی تھی خریداروں کا تانتا صبح سے شام تک بندھا رہتا۔ حکیم بدھن کے قہقہوں کے درمیان میری پنسل چلتی رہتی تھی اور یوں حسنِ یار اور زلف و رخسار کی باتیں ہوا کرتی تھیں ـــــ یاد شد بخیر! لکھنؤ کے محلہ نخاس (جہاں یہ فیکٹری قائم تھی) میں ایک بہت بڑا بازار لگا کرتا تھا (آج کل کی خبر نہیں)

رات ہی سے آکر دکاندار آکر دو رویہ جگہیں گھیر لیتے تھے۔ اور صبح کے ۵ بجے ہی اس بازار میں ہنگامہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ بازار پھڑ لے کنوئیں سے شروع ہو کر سعادت گنج کی ابتدائی حدود تک اور نخاس سے آمین آباد جانے والی سڑک پر نخی گنج کی ابتدا تک دو رویہ لگتا تھا۔ اس بازار میں کباڑیوں کی دوکانیں زیادہ ہوتی تھیں۔ جہاں ہر قسم کا سکینڈ ہینڈ مال بہت سستے داموں سے مل جایا کرتا تھا۔ لکھنؤ والے ہفتے بھر تک اپنی ضروریات روک کر اس بازار کے لگنے کا انتظار کرتے تھے۔ کباڑیوں کے علاوہ اس بازار میں پرانی کتابوں کی دوکانیں بھی بہت زیادہ لگتی تھیں۔ جہاں قلمی، نادر اور نایاب کتابیں بھی بعض اوقات آجایا کرتی تھیں۔ لکھنؤ کے بہت سے اہل علم اتوار کے دن اس بازار میں ضرور نظر آیا کرتے تھے۔ اس بازار میں بالکل میلے جیسا لطف آیا کرتا تھا۔ پان والوں، چاٹ والوں اور کباب والوں کے علاوہ مداری بھی کافی تعداد میں ادھر ادھر حلقہ جما کر اپنے اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ دوا فروش صاحبان بھی اتوار کے دن اس بازار میں اشعار پڑھ پڑھ کر مجمع لگا کر دوائیں فروخت کیا کرتے تھے۔

اتوار کا ذکر ہے کہ بیّا صاحب کے چائے خانے (فیکٹری) کے سامنے ایک سپیرا آکر بیٹھ گیا۔ اور اس نے اس دلکش انداز سے بین بجانا شروع کی کہ بہت سے دوا فروشوں اور مداریوں کے حلقے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے میں بھی فیکٹری کی کھڑکی سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ سپیرے نے پٹارے سے ایک سانپ نکالا۔ یہ سانپ کافی جسیم اور موٹا تھا۔ اس نے پھر اپنی بین شروع کی

اور سانپ نے اپنا چوڑا چکلا پھن پھیلایا۔ تقریباً زمین سے تین فٹ اونچا ہوا اور بری طرح جھومنے لگا۔ اس سپیرے کی بین سے جو دھن نکل رہی تھی باوجود اس کے کہ میں موسیقی سے قطعی نابلد ہوں مجھے مزہ دینے لگی۔ شائقین اور حلقے میں کھڑے ہوئے سب ہی لوگ اس دھن سے متاثر نظر آنے لگے۔ ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ بین بج رہی رہی۔ سانپ جھوم رہا تھا۔ یکایک سڑک پر چلتے ہوئے تانگے کا گھوڑا کسی چیز سے ڈر کر بھڑکا اور سیدھا اس فٹ پاتھ پر چڑھ گیا جہاں سپیرا بین بجا رہا تھا۔ تانگے والا گھوڑے کی راسیں بری طرح تانے ہوئے تھا۔ لیکن گھوڑا قابو سے باہر نظر آرہا تھا۔ فٹ پاتھ پر افراتفری مچ گئی۔ لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ برابر بیٹھے ہوئے دوکاندار بھی اپنا سامان گھوڑے اور تانگے سے محفوظ کرنے لگے۔ سپیرے نے گھبرا کر بین بند کر دی اور وہ بھی پیچھے ہٹا۔ گھوڑا اب اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں سانپ رقص کر رہا تھا۔ یکایک سانپ نے گھوڑے کی ٹانگ پر منھ مارا۔ وہ گھوڑا جو تنی ہوئی راسوں کے باوجود قابو میں نہیں آرہا تھا ایک دم رک گیا۔ اور اس نے کانپنا شروع کر دیا سواریاں جلدی جلدی تانگے سے نیچے اتریں وہ سانپ بھی لوگوں کے ہجوم میں گھبرا کر سیدھا چائے خانے میں داخل ہو گیا۔

سانپ کو دیکھتے ہی چائے خانے والے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے چہار جانب ایک ہلچل مچ گئی۔ حکیم بڈھن اس وقت کسی خریدار کو مال سپلائی کر رہے تھے۔ ان کی نظر سانپ پڑی۔ میں نے دیکھا وہ چونکے اور کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سانپ کی طرف کچھ پڑھ کر پھونکا اور بولے۔

"ادکیڑے کدھر جا رہا ہے۔ ادھر آ"
میں متحیر رہ گیا۔ سانپ بجائے سیدھا جانے کے ان کی طرف مڑا۔ حکیم بدھن اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے رہے۔ ان پر کوئی خوف وہراس طاری نہ تھا۔ انہوں نے اطمینان سے جھک کر سانپ کو ہاتھ میں اٹھا لیا اور سانپ کو مخاطب کر کے بولے۔

"یہاں آئے؟ ارے تم نے کسی کو کاٹا بھی ہے۔ تمہارا زبان بتا رہی ہے دوست!"

اتنے میں باہر سے شور اٹھا۔ حکیم بدھن ہاتھ میں سانپ پکڑے ہوئے باہر نکلے۔ میں بھی پیچھے پیچھے باہر آگیا۔ شور کی وجہ یہ تھی کہ تانگے والا سپیرے کے سر ہو رہا تھا کہ وہ گھوڑے کی قیمت اس کو دے۔ اس لئے کہ گھوڑا سانپ کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھوڑا مرا ہوا تھا اس کے منہ سے کف جاری تھا اور سپیرا حیران و پریشان کھڑا تھا ایک تو اس کو سانپ کے کھو جانے کا غم تھا۔ دوسرے یہ مصیبت اس کے سر پر آپڑی تھی حکیم بدھن کے ہاتھ میں سانپ دیکھ کر سپیرے کے چہرے پر تحیر اور خوشی دونوں کے آثار نمودار ہوئے۔ حکیم بدھن نے سپیرے کو سانپ دیتے ہوئے کہا۔

"اس کو بہت احتیاط سے رکھا کرو۔ یہ بڑی نایاب قسم کا سانپ ہے خدا جانے تمہارے ہاتھ کیونکر لگ گیا!"

اس سے گفتگو ختم کرنے کے بعد حکیم بدھن نے تانگے والے سے کہا۔

"ہوش کی دوا کرو۔ یہ نقصان تمہاری تقدیر میں تھا۔ اس غریب کا کیا قصور ہے۔ اگر تمہارا گھوڑا اس سانپ کو کچل کر مار دیتا تو اس سانپ کی قیمت سپیرے کو تم دیتے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گھوڑے کے بدکنے سے دوکانداروں کا جو نقصان ہوا ہے یہ کون دے گا؟ اور یہ جو گھوڑے کی بدولت لوگ بھاگتے ہیں ادھر ادھر گرے ہیں۔ کچھ معمولی زخمی بھی ہوئے ہیں اور کچھ کے کپڑے پھٹے ہیں اس کا معاوضہ کون دے گا تم!"

تانگے والا قائل ہو کر خاموش ہو گیا۔ حکیم صاحب چائے خانے میں پلٹ کر آئے اور انہوں نے ایک پیالی چائے کا آرڈر اپنے واسطے دیا تو میں نے زور سے کہا۔

"ایک پیالی اور منگواؤ"

وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

"مجھ سے کچھ باتیں کرنا ہوں گی استاد۔ جبھی تو میری میز پہ چائے پینے آ رہے ہو"

میں اتنی دیر میں ان کی میز پہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے پہنچتے ہی حکیم بدھن سے کہا۔

"یار بدھن تم تو چھپے رستم نکلے۔ یہ سانپ پکڑنے کا کمال تو میں نے آج ہی دیکھا۔

بولے۔ "بھیا بہزاد تم کو اس کا علم نہیں ہے۔ میں سانپوں کا بہت بڑا عامل ہوں۔ شاید مجھ سے بڑا عامل دور دور نکلے۔ میں نے یہ عمل ایک جوگی

سے سیکھا تھا۔ وہ جوگی اتفاق سے میرے گاؤں میں کہیں سے آگیا تھا۔ مجھے اپنے کھیت میں بیہوش پڑا ہوا ملا تھا۔ میں اسے گھر اٹھوا لایا اور والد مرحوم سے اس کا علاج کرایا۔ وہ تین سال تک میرے گھر رہا۔ اور تین مہینے مسلسل علاج اور پرہیز کے بعد جب کچھ ٹھیک ہوا تو اس نے مجھے یہ عمل بتانا شروع کیا وہ تین سال تک میرے گھر پر رہا۔ اس کا مرض مسلسل علاج کا متقاضی تھا تین سال وہ والد مرحوم کا علاج کرتا رہا۔ اور مجھے اس عمل میں کامل بناتا رہا۔

میں نے کہا۔ یار بڈھن جب تم اتنے صاحب کمال ہو تو اس فن سے کماتے کیوں نہیں۔ اس ٹیکرٹی کی ضرورت ہی کیا ہے"

حکیم بڈھن نے کہا۔ تم کو علم نہیں ہے۔ اس عمل کے کرنے والوں سے حلف لیا جاتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے کمائے گا نہیں۔ اگر وہ خلاف ورزی کرے تو اس کا جسم پھوٹ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں اس کام کو کرتا ہی نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ دردسری کون مول لے"

میں نے کہا "تو پھر بندگان خدا کی خدمت ہی کیا کرو۔ سانپ کے کاٹنے سے ملک میں لاکھوں آدمی روزانہ مرتے ہیں۔ تم کو ثواب ہوگا"

لفظ ثواب پر وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔

"بھیا میں ایسے ثواب سے درگزرا۔ اس لئے کہ عامل کی موت ایک نہ ایک دن سانپ ہی کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس جوگی کو سانپ کے کاٹنے سے مرا ہوا دیکھا۔ حالانکہ وہ ایسا عامل تھا کہ سارے ہندوستان میں شاید ہی اس جیسا کوئی ہو بیماری اس نہ مار سکی۔

والد صاحب کے علاج سے قطعی ہٹا کٹا ہو گیا تھا۔ مجھے آخری تعلیم دے چکا تھا ایک دن ایک طرف سے نکلا۔ معمولی قسم کا کیڑا۔ اور اس نے آتے ہی جوگی کو ڈس لیا۔ میں مطمئن کھڑا ہوا تھا کہ جوگی اس کو پکڑے گا۔ اس کے ڈسنے سے جب جوگی کی حالت بگڑی تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اس سانپ کو بہ آسانی پکڑ لیا۔ لیکن وہی جوگی جس کے عمل کا جواب نہیں تھا چند ہی لمحوں میں تڑپ کے مر گیا۔ جوگی کی موت نے مجھے کام سے نفرت دلا دی۔ آج مدتوں کے بعد میں نے یہ سانپ پکڑا۔ ورنہ میں تو سانپ کی طرف رخ بھی نہیں کرتا ہوں"۔

میں نے کہا۔" یار بڈھن بازار بھر نے تمہارا یہ کارنامہ دیکھ لیا ہے، اب تمہاری جان بچنا مشکل نظر آتی ہے"۔

حکیم بولے۔" میں کسی عالم میں بھی اس کام کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ بعض اوقات ایسے سانپوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جن کی خطرناکی کا علم عامل کو کبھی نہیں ہوتا۔ اور وہ اسی میں مار کھا جاتا ہے"۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

اس واقعے کے چوتھے یا پانچویں دن انتہائی گرمی کے باعث بیا صاحب نے فٹ پاتھ پر میزیں اور کرسیاں لگا دیں۔ تاکہ لوگ کھلی ہوا میں بیٹھ کر چائے نوشی کر سکیں۔ حکیم بڈھن کی میز اور میری میز بھی ایک طرف لگا دی گئی۔ میں حکیم بڈھن کی میز پر ان کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ میں نے دور سے ایک صاحب کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ لباس بھی امیرانہ تھا جس کپڑے کی شیروانی اسی کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ ان کے

ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس پر چاندی کی شام دور سے چمک رہی تھی۔ انکے پیچھے ایک ملازم کاندھے پر تولیہ اور ہاتھ میں چاندی کا خاصدان لئے ہوئے تھا اور ان دونوں کے پیچھے دو لمبے تڑنگے دیہاتی ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں لئے ہوئے تھے۔ حکیم بڈھن کی جوں ہی نظر ان پر پڑی کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بولے۔

"بھیا بہزاد جانتے ہو یہ کون ہیں"

میں نے کہا۔ "نہیں"

بولے۔ "یہ بہت بڑے زمیندار ہیں ددّو میاں۔ غالباً میرے ہی پاس آ رہے ہیں"

اتنے میں ددّو میاں فٹ پاتھ پر آ گئے۔ حکیم بڈھن لپک کر ان سے بغلگیر ہوئے اور ان کا ہاتھ تھامے ہوئے اپنی میز پر لے آئے۔ بالائی دار چائے کا آرڈر بابا صاحب کو دیتے ہوئے حکیم بڈھن نے کہا۔

"چودھری صاحب آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ کیا بات ہے آپ کو میری جان کی قسم جو مجھ سے کچھ چھپایئے"

چودھری صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب تم سے کیا چھپاؤں گا۔ میں تو تمہارے پاس مشورے ہی کے لئے آیا ہوں۔ میری عقل تو کچھ کام نہیں کر رہی ہے۔ چائے پی لوں تو تفصیل کے ساتھ بات بتاؤں"

اتنے میں چائے آ گئی۔ چودھری صاحب چائے مزے لے لے کر پینے لگے۔

چودھری صاحب کے ملازمین دور ایک طرف مؤدب بیٹھ گئے۔ ان کے لیے بھی حکیم صاحب نے چائے وہیں پہنچوادی تھی۔ حکیم بڈھن نے میرا تعارف چودھری صاحب سے کراتے ہوئے کہا۔

"چودھری صاحب ان سے ملئے یہ بڑے مشہور شاعر بہزاد لکھنوی ہیں اور یہ میرے نفس ناطقہ ہیں، یا میں ان کا۔"

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے ایک بلند قہقہہ مارا اور بولے۔ "آپ کی گفتگو کے درمیان کیا ان کو علیحدہ بٹھادوں یا ان کی موجودگی سے کوئی حرج نہیں پڑیگا۔"

چودھری صاحب نے جواب دیا۔

"ان کو بیٹھے رہنے دیجیے۔ میری گفتگو کچھ ایسی پرایویٹ نہیں ہے۔"

چائے ختم ہوتے ہی ملازم نے چاندی کا خاصدان لاکر سامنے رکھ دیا۔ چودھری صاحب نے تولیئے سے ہاتھ پونچھے اور پھر پان کی چار گلوریاں ایک ایک ساتھ منہ میں رکھتے ہوئے خاصدان میرے اور حکیم بڈھن کے سامنے رکھ دیا۔ ہم دونوں کے پان کھالینے کے بعد بولے۔

"حکیم صاحب تم کو معلوم ہے کہ میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ شرفو میاں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ ایسا کڑیل اور خوبصورت جوان سارے جوار میں کہیں نہیں ہے۔ اس کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ دن بدن زرد ہوتا جارہا ہے چہرہ اور جسم بھی اترتا جارہا ہے۔ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اتنا ملنسار اور ہنسنے بولنے والا لڑکا اب دنیا سے بیزار نظر آنے لگا ہے۔"

حکیم بڈھن نے پوچھا۔ "اور کوئی خاص بات؟"

چودھری صاحب نے کہا۔

"ہاں۔ اس کی یہ کیفیت منگل اور اتوار کو خصوصیت کے ساتھ خراب ہو جاتی ہے۔ ان دونوں دنوں میں وہ اندر بند کمرے میں سوتا ہے۔ خواہ کیسی ہی گرمی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔ حالانکہ اس بیماری سے پہلے تک اس کا یہ حال تھا کہ گلابی جاڑوں تک باہر ہی سوتا تھا۔

حکیم بڈھن کا چہرہ اس گفتگو کے بعد کچھ فکر مند سا ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا۔

"اور کوئی خاص بات۔ براہ کرم چودھری صاحب چھوٹی سی چھوٹی بات بھی نظر انداز نہ فرمایئے۔"

وہ بولے۔" اور کوئی خاص بات تو نہیں بجز اس کے کہ منگل اور اتوار کے دن جب وہ بند کمرے سے صبح کے وقت باہر نکلتا ہے تو اس کے ہونٹ نیلے ہوتے ہیں۔ اور دن بھر اس کے لعاب دہن کا رنگ بھی نیلاہٹ لئے ہوئے ہوتا ہے۔"

حکیم بڈھن نے پوچھا۔" کوئی علاج کیا؟"

چودھری صاحب نے کہا۔

"علاج؟ حکیم صاحب کونسا ایسا علاج ہے جو میں نے نہیں کیا۔ تقریباً تمام ڈاکٹر اور حکیم علاج کر چکے ہیں۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لوگوں کے کہنے سننے سے میں نے کوئی عامل اور سیانا بھی نہیں چھوڑا لیکن کسی علاج سے کبھی ذرہ برابر فائدہ نہیں ہوا۔ میں اسی لئے گھبرا کر تمہارے پاس آیا ہوں

مجھے معلوم ہے کہ تم شہر کی ناک ہو۔ شاید کوئی طریقۂ علاج مجھے بتا سکو۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔"چودھری صاحب صاحبزادے کو یہ مرض کب سے ہوا۔ براہ کرم مجھے اس کی تفصیل بتائیے۔ پھر میں کوئی علاج یا معالجہ بتا سکوں گا۔"

چودھری صاحب نے کہا۔

"حکیم صاحب لڑکے کی بیماری کو چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ کہنے کی بات تو نہیں ہے لیکن کہنا پڑتا ہے۔ میرے ایک بڑے گہرے دوست ہیں ٹھاکر کرپا سنگھ۔ وہ بھی میری ہی طرح ایک بڑے زمیندار ہیں۔ ان کی زمینیں کہیں ناگپور یا بھوپال کی طرف ہیں۔ ان کی عمر بھی میری ہی طرح ہے۔ ان کی بیوی کو مرے ہوئے تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی اولادوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ لیکن تقریباً ایک سال ہوا وہ شکار کے سلسلے میں نیپال کی ترائی گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے جنگلوں میں ان کے ہاتھ ایک بے حد حسین و جمیل عورت لگ گئی جس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ ان کے ملازمین کا بیان ہے کہ ٹھاکر صاحب ایک دن شکار کو گئے۔ وہاں سے یہ عورت لے آئے۔ وہ اس عورت کو لئے ہوئے سیدھے میرے پاس آئے اور یہاں اس سے باقاعدہ شادی کرلی۔ میں نے ان کے قیام کے لئے اپنی حویلی کا آدھا حصہ دے دیا تھا جو آج تک ان کے قبضے میں ہے۔ وہ اپنے وطن یوں نہیں گئے کہ اپنی اولادوں سے اس شادی کو چھپانا چاہتے تھے۔۔۔"

حکیم بدھن نے کہا۔

"معاملہ دلچسپ ہے۔ ذرا تفصیل سے بیان کرتے رہیئے۔ براہ کرم جزوی معاملہ بھی فراموش نہ کیجیئے گا"

چودھری صاحب نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن وہ اپنی دلہن کو لیکر حویلی کے اس حصے میں آئے جہاں میرا قیام ہے۔ میرے پاس شرفو بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس عورت کا بے پناہ حسن دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ انہوں نے اس کا تعارف کرایا۔ اور تعارف کے بعد ہی وہ اس بیباکی کے ساتھ گفتگو کرنے لگی کہ مجھے حیرت ہونے لگی۔ اس کو نئی دلہن ہونے کا بھی احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھائے ہوئے تھی حالانکہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ اپنی آنکھوں پر سے کسی وقت بھی چشمہ جدا نہیں کرتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کو روشنی کچھ برداشت نہیں ہے۔ یہ سن کر میں چپ ہو رہا"

حکیم بدھن نے پوچھا "پھر"

اور پھر کیا۔ شادی کے بعد ہی ٹھاکر صاحب کی یہی کیفیت شروع ہوئی جو شرفو کی ہے۔ ڈاکٹر پہ ڈاکٹر بلائے گئے حکیم پہ حکیم آئے۔ لیکن مرض تشخیص نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود ٹھاکر صاحب چلنے پھرنے کے لائق بھی نہ رہے۔ نوکروں نے ان کی اطلاع کے بغیر ان کی اولادوں اور کو حال لکھا۔ وہ سب کے سب آ دھمکے شادی کا حال تو کھل گیا لیکن کسی نے

ان سے کوئی شکایت نہ کی۔ ان کی حالت بھی شکوے شکایت کے لائق نہ تھی۔ نئی دلہن سے مریض کا چارج لے لیا اور علاج شروع ہوا۔

حکیم بدھن نے کہا۔ "پھر کیا ہوا"

چودھری صاحب بولے۔

"حکیم صاحب تمہارے اتنا کریدنے سے ایک بات میری سمجھ میں آنے لگی ہے اور وہ یہ ہے کہ ادھر ٹھاکر صاحب کو رفتہ رفتہ صحت ہونے لگی ادھر شرفو کو وہی مرض لاحق ہونے لگا"

حکیم صاحب نے زور کا ہنکارا بھرا اور بولے۔

"چودھری صاحب معاف کیجئے گا۔ میں آپ کے صاحبزادے کا مرض تقریباً حالات سن کر ہی پہچان گیا ہوں مزید تحقیق کے لئے مجھے ایک ہفتے تک روزانہ آپ کے ہاں آنا پڑے گا"

چودھری صاحب بولے۔ "حکیم صاحب تم ایک ہفتے کے لئے میرے تعلقے ہی کیوں نہیں چلے چلتے؟"

حکیم بدھن بولے۔ "چودھری صاحب میں دن بھر تو شہر چھوڑ نہیں سکتا ہوں۔ میرا کاروبار بالکل ٹھپ ہو جائے گا۔ میرے بغیر یہ فیکٹری ایک منٹ نہیں چل سکتی۔ آپ نظر گھما کر دیکھئے دو چار حضرات بائیں جانب کنارے والی میز پر بیٹھے ہیں میرے پاس آئے ہیں چونکہ میں آپ سے باتوں میں اتنا مصروف ہوں لہٰذا وہ انتظار کر رہے ہیں"

چودھری صاحب بولے۔ "حکیم صاحب تمہارا نقصان میں کوئی

کوڑی ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جہاں اب تک میرے ہزاروں روپے اُٹھ چکے ہیں وہاں اور بھی سہی۔ روپے پیسے کی تم فکر نہ کرو۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "چودہری صاحب یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے میں آپ سے اپنی محنت کا کوئی معاوضہ لے ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک راز ہے جس کو آپ سمجھ نہ سکیں گے اور ساتھ ہی ساتھ میری جان جوکھم کا کام بھی ہے۔ لہٰذا میں صرف رات کے آٹھ بجے فارغ ہو سکوں گا۔ اس کی کچھ سبیل آپ ہی نکالئے۔"

وہ بولے۔ "سبیل کیا نکالنا حکیم صاحب۔ میرا مقام لکھنؤ سے کل بیس میل کی مسافت پر ہے۔ میری موٹر ٹھیک سات بجے شام آپ کو لے جانے کے لئے آجایا کرے گی۔ آپ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ لیں گے۔ اور واپسی بھی آپ کی اسی موٹر کے آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "تو بہتر ہے میں انشاء اللہ کل حاضر ہوں گا۔"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

دوسرا دن فیکٹری میں بڑا گھما گھمی سے گزرا۔ آج اور دنوں سے زیادہ ہی کام تھا۔ میرے دل میں اس واقعے کے پوچھنے کی خلش تو تھی ہی۔ لیکن دل جانتا تھا کہ حکیم بڈھن بتانے والی آسامی نہیں ہے۔ لہٰذا میں خاموش ہو گیا شام کو سات بجے موٹر آکر کھڑی ہو گئی۔ مجھ سے حکیم بڈھن بولے۔

"چچا تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یار مجھ کو لے جا کر کیا کرو گے۔ ان میں بچوں میں جاؤں گا ذرا دل بہلنے کے بعد ان کی خبر تو لے لوں۔"

وہ قہقہہ مار کر بولے

"تمہارا سب سے بڑا بچہ تو میں ہوں چچا۔ اب مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ میں اگر چودھری صاحب سے پتہ نہیں لے رہا ہوں تو کیا تم کو بھی نہیں دلوا سکتا ہوں۔ چنیو یار تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔"

میں کیا کہتا۔ حکیم نے فوراً کام بند کر دیا۔ وہ خریدار جو آئے ہوئے تھے۔ ان کے خلاف اصول کل بلا کر خود کار میں بیٹھ گئے۔ میں بھی برابر ڈٹ گیا۔ موٹر تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ واقعی کوئی آدھ گھنٹے میں کار چودھری صاحب کی حویلی میں پہنچ گئی۔ حویلی کیا تھی اچھا خاصا چھوٹا سا قلعہ تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ باہر چودھری صاحب تختوں کے چوکے پر گاؤ تکیے سے لگے ہوئے بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر ان کے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ متعدد حقے سلگ رہے تھے۔ درمیان میں چاندی کا خاصدان رکھا ہوا تھا۔ موٹر دیکھتے ہی چودھری صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"آؤ حکیم صاحب آؤ۔ مجھے تمہارا بڑی فرح انتظار تھا۔"

حکیم صاحب اور میں دونوں چودھری صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے نوکروں نے فوراً شربت لا کر سامنے رکھ دیا۔ غالباً پہلے سے تیار تھا۔

حکیم بدھن بولے "چودھری صاحب یہ کیا چیز ہے۔ ارے صاحب ہم دونوں کی رگ رگ میں چائے ہے۔ وہی ہم پیتے ہیں وہی پلاتے ہیں۔"

چودھری صاحب نے ایک قہقہہ مارا اور نوکروں کو کچھ اشارہ کیا۔ شربت سامنے سے اٹھا لیا گیا۔ اب چودھری صاحب نے چیخ کر کہا۔

"شرفو بھیا کو بلا کر لاؤ۔"

ہم نوٹ پان کھا ہی رہے تھے کہ حویلی سے ایک نوجوان کو دو آدمی پکڑے ہوئے لاتے نظر آئے۔ میں حیران رہ گیا۔ چودھری صاحب کا لڑکا واقعی حسین نوجوان تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں کے علاوہ ستواں کھڑی ناک اس کے کتابی چہرے پر بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ۲۲۔۲۳ سال عمر ہو گی۔ جسم بھی بیحد طاقتور اور توانا معلوم ہوتا تھا۔ دو آدمیوں کے سہارے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تخت کے قریب پہنچ کر اس نے ہم دونوں کو سلام کیا۔ میں نے غور سے دیکھا اس کی آنکھیں اس طرح چڑھی ہوئی تھیں جیسے کسی شرابی کی آنکھیں۔ اسکے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے صبیح رنگ پر زردی بری طرح جھلک رہی تھی۔ ایک گاؤ تکیے کے سہارے وہ بٹھا دیا گیا۔

حکیم صاحب نے اس کو بغور کئی بار دیکھا۔ بڑھے اور اس کے جسم کو سونگھنا شروع کیا۔ میں نے حکیم بدھن کے چہرے پر فکر کے آثار دیکھے یکایک وہ بولے۔

"چودھری صاحب ذرا آدھ سیر گرم دودھ تو منگائیے۔ مل جائے گا؟"

چودھری صاحب بولے۔ آدھ سیر؟ اجی حکیم صاحب دس بیس من کہو تو ابھی آجائے۔ آدھ سیر گرم دودھ لاؤ۔

دودھ آجانے کے بعد حکیم بدھن نے اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اس میں کچھ سفوف تھا۔ جس کی ایک چٹکی حکیم بدھن نے دودھ کے گلاس میں چھڑک دی اور گلاس خود ہلانا شروع کیا۔ پھر دودھ چودھری صاحب کے صاحبزادے کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس کو سب کا سب پی لیجئے شرفو میاں"

مریض نے پورے کا پورا دودھ پی لیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ دودھ پیتے ہی اس کی چڑھی ہوئی آنکھیں ٹھیک حالت پر آگئیں۔ چہرے کی زردی بھی کم ہو گئی۔ اور اب وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم میں چستی پیدا ہو گئی۔ میری ہی طرح حکیم بڈھن بھی مریض کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یکایک کہا۔

"شریفو میاں ذرا کھڑے ہو کر ادھر ادھر ٹہلیے تو۔"

کہنے کی دیر تھی مریض بغیر کسی سہارے کے آسانی سے کھڑا ہو گیا اور تخت سے اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

حکیم بڈھن نے پوچھا "اب کیا حال ہے"

وہ بولا۔ "حکیم جی جسم پر جو بوجھ تھا وہ ایک دم سے جاتا رہا۔ میں اپنے آپ کو بالکل تندرست محسوس کر رہا ہوں۔"

چودھری صاحب نے یہ جواب سن کر حکیم بڈھن کو لپٹا لیا اور بولے۔

"واقعی حکیم صاحب تم باکمال آدمی ہو۔ ارے ایک پڑیا میں مرض دور۔"

حکیم بڈھن بولے۔ "نہیں چودھری صاحب یہ تو مخض سنبھالا ہے۔ اصل علاج تو اب ہونا ہے۔ براہ کرم مجھے وہ کمرہ دکھائیے جس میں منگل اور اتوار کو صاحبزادے آرام فرماتے ہیں۔"

چودھری صاحب خود ہمیں لے کر حویلی میں داخل ہوئے۔ داہنی جانب زینوں پر چڑھ کر ہم ایک کھلی چھت پر پہنچے۔ جہاں ایک بڑا سجا ہوا کمرہ تھا۔ حکیم بڈھن نے اس کمرے کو چاروں طرف پھر پھر کر اندر سے دیکھا۔ انہوں نے

بستر کو کئی بار سونگھا۔ یہاں تک کہ کمرے میں بنی ہوئی ایک نالی کے پاس وہ رک گئے۔ جھکے اور اس نالی کو سونگھنا شروع کیا۔ میں حیران حیران حکیم کی یہ حرکتیں دیکھتا رہا حکیم بدھن اس دوران بالکل خاموش رہے اور معائنے کے بعد نیچے اتر آئے۔ دسترخوان پر کھانا لگا ہوا تھا چودھری صاحب کے بے حد اصرار پر ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ اور حکیم بدھن دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس ہو گئے۔ ٹھیک دس بجے میں اور حکیم بدھن بیا صاحب کے جائے خانے میں اترے۔

٭ ٭ ٭

دوسری رات جب ہم دونوں چودھری صاحب کی حویلی پہنچے تو وہاں جشن کا سماں تھا۔ گانے بجانے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ حکیم بدھن کو دیکھتے ہی چودھری صاحب بولے۔

حکیم صاحب تمہارا ہی انتظار تھا۔ ارے بھیا ماشاءاللہ لڑکا بالکل چنگا ہے آج دن بھر دوستوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ تاش پتے کھیلتا رہا۔ کہیں سے کہیں تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ چھ ماہ سے بیمار ہے۔"

حکیم بدھن نے کہا چودھری صاحب اللہ مبارک کرے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ سنبھالا ہے۔ ذرا آپ تنہائی میں چل کر میری بات کا جواب دیدیں۔"

چودھری صاحب الگ کونے میں چلے آئے۔ حکیم بدھن نے ان سے پوچھا۔ ٹھاکر صاحب کی دلہن کیا بہت عطر وغیرہ لگاتی رہیں؟"

وہ بولے۔ ارے ہاں یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا۔ وہ تو عطر میں ایسی

ڈ دبی رہتی ہیں کہ اتنی زیادہ خوشبو ناگوار گزرتی ہے۔

حکیم صاحب نے کہا۔ چودھری صاحب! آج جمعرات ہے۔ کل جمعہ ہوگا پرسوں ہفتہ اور ترسوں اتوار ہوگا۔ مہربانی فرماکر اس کمرے میں کسی بہانے سے آپ دو تین سوراخ دیواریں اس طرح کروالیں کہ صاحبزادے کو خبر نہ ہو اور اندر کی ہر بات آسانی سے نظر آسکے۔ حتی الامکان اس کاروائی کی خبر آپ کے ملازمین کو بھی خبر نہ ہونے پائے تو اچھا ہے۔ اور اتوار کی رات میں میں اور بڑھن دونوں آپ کے یہاں قیام کریں گے۔ ذرا صاحبزادے کو بلوائیے میں آج پھر دودھ میں دوا پلا دوں۔ علاج مسلسل ہونا ہے اتوار تک۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اتوار کو جب میں اور حکیم دونوں حویلی پہنچے تو چودھری بری طرح منتظر تھے شرفو میاں بھی ہشاش بشاش بیٹھے ہوئے تھے۔ حکیم بڈھن کو دیکھتے ہی بولے

"حکیم صاحب دودھ منگواؤں"

حکیم بڈھن نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"دودھ مزہ دے رہا ہے شرفو میاں منگواؤ"

دودھ آیا۔ حکیم صاحب نے سفوف چھڑک دیا۔ شرفو میاں دودھ پی کر اور چیت ہوگئے۔ ۹ بجے کے قریب کھانا لگا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حکیم بڈھن نے کہا چودھری صاحب اگر اجازت ہو تو شرفو میاں کے ساتھ آج کوٹ پیس کھیل لوں۔ سنتا ہوں یہ خوب کوٹ پیس کھیلتے ہیں۔ آج ان کو ذرا میں بھی پیوا دوں۔ سنتا ہوں یہ دوسروں کو خوب پیولتے رہیں۔

چودھری صاحب بولے "ارے ہاں ہاں حکیم صاحب کھیلو، چلو میں اور شرفو ایک طرف، تم اور بہزاد ایک طرف!!"

چلیے جناب کوٹ پیس شروع ہو گیا۔ میں نے پہلی بار حکیم بڈھن کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ ظالم ہر بازی جیت رہا تھا۔ کھیل واقعی دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتا گیا۔ مصاحبین سب کے سب حکیم بڈھن کی ایما پر رخصت ہو گئے تھے۔

ہم چار آدمی کھیل رہے تھے کہ میری ناک میں ایک عجیب قسم کی لیساند آنا شروع ہو گئی۔ ہوا پروائی چل رہی تھی۔ اس لیساند پر حکیم بڈھن بھی چونکے یکایک میں نے دیکھا کہ شرفو کی آنکھیں چڑھنا شروع ہو گئیں۔ وہ گویا دم بخود سا ہو گیا۔ اس نے تاش کے پتے ہاتھ سے پھینک دیئے اور بے اختیارانہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تخت سے نیچے اتر کر اس نے جوتا بھی نہیں پہنا۔ اور ننگے پیر ہی تیز قدموں کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا۔

حکیم بڈھن نے منہ پر انگلی رکھ کر چودھری صاحب کو روکا۔ خود نیچے اترے مجھے اور چودھری صاحب کو اشارے سے ساتھ لیا اور حویلی کے اندر داخل ہو کر چھت پر پہنچے۔ کمرہ کا دروازہ اسی وقت بند ہوا تھا۔ حکیم بڈھن نے چودھری صاحب سے پوچھا۔

"سوراخ کس طرف ہیں"

چودھری صاحب ہم دونوں کو ساتھ لئے ہوئے بائیں طرف مڑے واقعی تین بڑے بڑے سوراخ دیوار میں موجود تھے۔ ہم تینوں ان سوراخوں سے آنکھیں لگا کر دیکھنے لگے۔ اندر ایک لیمپ روشن تھا جو میز پر رکھا ہوا تھا

اور دیوار گیری کے کئی لیمپ اور بھی روشن تھے۔ روشنی اتنی زائد تھی کہ کمرے کی چھوٹی چھوٹی چیز بھی بہ آسانی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پلنگ پر شرفو آنکھیں بند کئے تنہا لیٹے ہیں۔ یکایک نالی سے ایک سانپ اندر داخل ہوا۔ یہ سانپ تقریباً دو گز لمبا اور نو دس انچ موٹا تھا۔ اس کا رنگ بھورا تھا اور کہیں کوئی پتی یا دھبا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سانپ کمرے میں پہنچتے ہی لوٹنے لگا اور اب سانپ کی جگہ ایک بے حد حسین و جمیل عورت نظر آنے لگی۔ جس کی عمر بمشکل اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے شرفو کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے کھولیں۔ شرفو بے اختیارانہ اس عورت سے بغلگیر ہو گیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ہم تینوں اس منظر کو دیکھنے کے بعد نیچے اتر آئے۔ چودھری صاحب کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ بہت خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ نیچے اترنے کے بعد جب انہوں نے ٹھنڈا شربت پیا تو ان کے حواس قابو میں آئے اور بولے

"حکیم صاحب یہ تو ٹھاکر صاحب کی دلہن ہے"

حکیم بڈھن نے کہا۔

"مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اگر میں آپ سے یہ بتا دیتا تو آپ کو یقین نہ آتا۔ بات یوں ہے کہ ہزار برس کے بعد سانپ میں یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب چاہے انسان کا قالب اختیار کر لے اور جب چاہے سانپ کی شکل اختیار کر لے۔ لوگ اس کو فرضی اور من گھڑت کہتے ہیں۔ لیکن

مشاہدے کے بعد آپ کیا کہیں گے؟ یہ ٹھاکر صاحب کی دلہن دراصل ایک ناگن ہے۔ وہ غالباً ٹھاکر صاحب کو نینیال کے جنگلوں میں ہاتھ لگ گئی اور یوں آپ کے گھر تک پہنچی۔ یہ ظاہر امر ہے کہ سانپ اور انسان کے ملاپ میں انسان کا ہی نقصان ہو گا۔ اور وہی ہوا۔ ٹھاکر صاحب کی موت کے پہلے ان کے اعزا اور اقربا نے ان کو گھیر لیا۔ ناگن کو اندوں کی موجودگی میں جب ٹھاکر صاحب سے تخلیہ نصیب نہ ہو سکا تو اس نے تمر فو میاں کو پھانسا وہ تو خیریت ہوئی کہ آپ تہہ تک پہنچ گئے ورنہ خدا نہ کرے آپ کو سر پہ ہاتھ دھر کر رونا پڑتا۔ اس کا عامل سوائے میرے اور شاید کوئی دوسرا مل سکے۔

چودھری صاحب نے روتے ہوئے حکیم بڈھن کے پیر پکڑ لیے اور بولے حکیم صاحب جو مانگئیں دونگا۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔ اگر تم کہو تو میں اپنا سارا تعلقہ تمہارے نام لکھ دوں لیکن کسی طرح اس ناگن سے میرے بیٹے کو بچا لو۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "چودھری صاحب اس سلسلے میں میرے واسطے ایک پیسا بھی لینا حرام ہے۔ میں حلف اٹھا چکا ہوں کہ میں اس کام کو کسی پہ نہ کرتا لیکن آپ آگئے اور مجھے آپ کی حالت پر رحم آگیا۔ مجھے ایک پیسا بھی لینا نہیں ہے۔ لیکن آپ کو بہزاد کو ان کی محنت اور دوڑ دھوپ کا معاوضہ دینا ہو گا۔ اور وہ بھی جو آپ کی مرضی میں آئے۔ لیکن خدا کے لیے اتنا نہ دیجئے گا کہ فیکٹر نچوڑ کر اٹھ جائیں۔ یہ مجھ سے بیزار ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیوں بکتے ہو۔ کون بیزار ہے۔ خواہ مخواہ الزام لگاتے ہو۔"

وہ قہقہہ مار کر بولے۔

"یار ذرا سی بات کا برا مان گئے۔ اور چودھری صاحب آپ کو معلوم نہیں ہے اس ناگن کی موت عاملوں کے اختیار سے باہر ہے اسکی موت کسی اس سے زبردست زہریلے سانپ کے کاٹنے سے ہی ہو سکتی ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ میں آج کل سے ایسے سانپ کی تلاش شروع کرتا ہوں لیجئے یہ سفوف کی پڑیا رکھ لیجئے۔ سویرے صاحبزادے کو دودھ کے ساتھ پلا دیجئے۔ گھبرائیے گا نہیں۔ ان کو کئی مرتبہ استفراغ ہوگا جس کے ذریعے ان میں سرایت شدہ زہر نکل جائے گا۔ جب تک مجھے ایسا سانپ دستیاب نہیں ہوگا یہی سفوف بطور بدرقہ استعمال ہوتا رہے گا۔"

* * * *

دوسرے دن سویرے ہی حکیم بڈھن نے فیکٹری کے اوقات کار بدل دیئے۔ صبح ۶ بجے سے ۸ بجے تک اور شام کو ۴ بجے سے ۷ بجے تک۔ بڑا صاحب کو زبانی ہدایات دیدی گئیں جو صاحب بھی حکیم بڈھن کو پوچھیں ان کو ان ہی اوقات میں بلایا جائے۔ ٹھیک ۸ بجے حکیم بڈھن نے دن بھر کے لئے ایک تیز یکہ کرائے پر لیا اور شہر کے قرب و جوار کے جنگلوں کے قریب پہنچ کر یکہ روک دیا جاتا۔ میں یکہ پر بیٹھا رہتا اور حکیم بڈھن خدا جانے کدھر کدھر درختوں اور جھاڑیوں میں مارے مارے پھرتے۔ واپسی پر اترا ہوا چہرہ ان کی ناکامی کا اظہار کر دیتا۔ یکہ پھر روانہ ہو جاتا اور کسی جھاڑ جھنکار کے پاس رک جاتا۔ میں اس ڈیوٹی سے تنگ آگیا۔ ایک بیہودہ کار خیر دو تو

میں اپنی پنسل اور کاغذ سے یکے پر بھی ہاکا مری میں بدل لیتا تھا۔ لیکن چائے شریف کی عدم موجودگی ادھ موا کر دیتی تھی۔ کہاں فیکٹری میں بھرچائے شریف رہتی تھی اور کہاں ان جنگلوں میں اس کی نایابی۔ اس پہ طرہ یہ کہ دن بھر تکان کے بعد فیکٹری کا کام اور پھر روزانہ چودھری صاحب کی حویلی پر حاضری۔

شرفو پہ حکیم بدھن کا سفوف بڑا اچھا کر رہا تھا۔ پیر کو صبح واقعی ان کو استفراغ ہوئے اور پتلا پتلا سا مواد خارج ہوا جس کے بعد مریض کی حالت پھر سنبھل گئی۔ منگل کو بھی رات کے بارہ بجے مریض حسب معمول کمرے میں جا پہنچا اور بدھ کو پھر حکیم صاحب کے سفوف سے سرایت شدہ زہر خارج ہو گیا۔

بہر حال مریض دن بدن چونچال اور تندرست رہنے لگا۔ ایک اسی تک و دو میں گزر گیا۔ لیکن حکیم جنگلوں میں کچھ نہ مل سکا۔ حکیم بدھن واقعی خود بھی پریشان ہو گیا۔ یکے والے کو روزانہ کرائے کی رقم حکیم کو خود اپنی جیب سے ادا کرنی پڑتی تھی۔ غرضیکہ راستے کی چائے، پان اور سگریٹ کا بار بھی حکیم صاحب ہی کے ذمے تھا۔ غرض اچھا خاصا بار تھا۔ ایک دن میں نے حکیم بدھن سے کہا۔

"یار چلنے دو یونہی کیوں اپنی جان کھپاتے ہو۔ اور پیسہ الگ ضائع کر رہے ہو نا"

وہ بولے "نہیں بھیا جس کام میں ہاتھ ڈال دیا اس کو کر کے ہی چھوڑا ہے کیا تم نے وہ شعر نہیں سنا۔

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود۔ مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے کہا "سنا تو ہے لیکن آسان ہو تو سمجھوں"

اس روزانہ کی جنگل بازی کو دسواں دن تھا کہ حکیم بڈھن نے گول دروازے سے ٹھاکر گنج جانے والی سڑک پر تقریباً چار میل پر یکہ رکوایا اور مجھ سے پہلی بار کہا۔

"بہزاد۔ ذرا میرے ساتھ آنا"

میں دیکھا کہ وہ فضا میں کچھ سونگھ رہے تھے۔ میں ساتھ ہو لیا۔ داہنی طرف خورد درختوں اور جھاڑیوں کا ایک بڑا قطعہ تھا۔ جن کے درمیان شاہی زمانے کی ایک بوسیدہ سی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔ حکیم اسی طرف بڑھے۔ میں بھی ساتھ ساتھ ہی تھا۔ حکیم برابر فضا میں کچھ سونگھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس عمارت کے پاس پہنچ گئے۔ یہ عمارت کبھی زمانے میں بڑی عظیم الشان رہی ہو گی۔ اب تو محض کھنڈر تھا۔ چہار دیواری پوری گری پڑی تھی۔ صرف ایک طرف ایک کھنجی سی موجود تھی حکیم صاحب اسی کھنجی کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ زمین سونگھنا شروع کی۔ پھر مجھ سے بولے۔

"بہزاد! اس ٹوٹی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ سکو گے؟"

دیوار کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اوپر کا حصہ گر چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"کیا مشکل ہے"

بولے۔ چڑھ کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے دیکھتے رہو۔ میں کیا کرتا ہوں

بالکل جیسے تماشا ہے یا نہیں"

میں نے کہا "بہتر"

بولے" اس کی تیلیاں جیب میں ڈال لو اور خالی ڈبیا میرے ہاتھ میں دیدو۔"

میں نے تعمیل کی اور دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی بانسری نکالی۔ مشکل سے چھ انچ لمبی ہوگی۔ اس کو منہ سے لگا لیا اور اکڑوں بیٹھ کر بجانا شروع کی۔ آپ یقین مانیں میں نے ایسی سریلی بانسری کم سنی ہے۔ عجیب دل آویز دھن تھی۔ تمام سپیروں کی دھن سے قطعی مختلف۔ میں حکیم کے کمال سے بھی نابلد تھا۔

باوجود موسیقی سے قطعی ناواقفیت کے اس کی دھن میں کھو گیا۔ حکیم بڈھن کو بانسری بجاتے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے ہونگے کہ اس جانب سے ایک سفید سانپ نمودار ہوا۔ جو لمبائی میں دو انچ سے زیادہ نہ ہوگا۔ پہلے تو میں اسے کوئی کیڑا سمجھا۔ لیکن جب وہ اپنا ننھا سا پھن نکال کر آدھے جسم سے کھڑا ہو گیا اور اس نے بانسری کی دھن پر جھومنا شروع کیا تو میں سمجھا کہ یہ سانپ ہے۔ اب میں حیرت سے حکیم کے اس کھیل کو دیکھنے لگا۔ حکیم نے اب بانسری کے اتار چڑھاؤ میں کوئی بات پیدا کر دی کہ سانپ کا رقص تیز ہونا شروع ہوا۔ دو تین منٹ کے بعد میں نے سانپ کو سست ہوتے دیکھا۔ یکایک حکیم کا ایک ہاتھ تیزی سے بڑھا۔ اس نے چٹکی سے سانپ کو پکڑ کر ماچس کی خالی ڈبیا میں ڈال کر بند کر لیا۔ اور مجھ سے کہا۔

"آؤ بہزاد کام ہو گیا۔"

میں حکیم کے ساتھ خاموشی سے یکے پر بیٹھ گیا۔ آج ہم چائے خانے

دو بجے ہی پہنچ لئے۔ چائے خانے پہنچنے کے بعد حکیم بدھعن نے چائے پیتے ہوئے کہا۔
"استاد کچھ سمجھے؟"

میں نے کہا کچھ نہیں۔ بجز اس کے تم نے ایک نایاب قسم کا سانپ پکڑ لیا ہے۔ مگر چھوٹا ہے۔"

وہ بولے۔" نایاب! اجی یہ لفظ تو کچھ نہیں ہے۔ تم اس کے چھوٹے قد پر نہ جاؤ۔ اس کے زہر کا توڑ شاید کسی کے پاس نہ نکلے۔ اس کی طاقت کا بھی جواب نہیں ہے۔ اس کی طاقت دیکھو گے؟"

میں نے کہا۔" دکھاؤ"

حکیم بدھعن نے وہ ماچس کی ڈبیا نکال کر میز پر رکھی۔ ماچس کے اندر سے عجیب و غریب غراہٹ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اتنی تیز کہ لوگ بھی ادھر ادھر سے آ کر میز کے گرد جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ماچس کی ڈبیا اچھلی اور تقریباً ایک فٹ کے فاصلے پر گری۔ پھر اچھلی، پھر اتنے ہی فاصلے پہ گری۔ پھر اچھلی اور پھر اتنے ہی فاصلے پہ گری۔

حکیم بدھعن نے کہا۔" دیکھ لی اس کی قوت؟ کیوں نہ یہ چودھری صاحب والا تماشا آج ہی ختم ہو جائے۔ ہے حضرت گنج جا کر ایک ٹیکسی لے آؤ بھیا بہزاد۔"

میں نے کہا" ٹیکسی کے بڑے دام پڑیں گے بھیا۔ کیا کر سکتے ہو۔ شام کو کار آ جائے گی تو چلنا۔"

وہ بولے۔" یار مجھے پیسے لینے حرام ہیں۔ نہ کہ ٹیکسی والے کو بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور چودھری صاحب دن ہی میں یہ کھیل دیکھ لیں۔ جاؤ جاؤ

ایک تیز تانگہ لے کر حضرت گنج چلے جاؤ۔"

میں روانہ ہو گیا اور تقریباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ٹیکسی لے کر آ گیا ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب چودھری صاحب کی حویلی پہنچے تو دس بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ باہر تختوں کا چوکا لگ چکا تھا چودھری صاحب خود پانی چھڑکوا رہے تھے۔ حکیم صاحب کو دیکھتے ہی بولے۔

"خیریت حکیم صاحب ناوقت کیسے آ گئے۔"

حکیم بدھن نے کہا۔ پہلے تو ٹیکسی کو رخصت کر دیجئے۔ پھر بتاؤں گا۔

ٹیکسی رخصت کر دی گئی۔ پھر حکیم صاحب بولے۔

آج میں یہ کھیل ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں کہ آپ، شرفو میاں اور آپ کا گھر بھر یہ تماشا دن ہی دن میں دیکھ لے۔ رات میں اس تماشے کا اتنا مزا نہیں آئے گا۔ مہربانی فرما کر آپ سب حضرات کوٹھے پر چلے جائیں۔ یہاں مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ بہزاد کو بھی ساتھ لیتے جائیے۔"

چودھری صاحب، مریض شرفو میاں اور تمام مصاحبین مع جملہ ملازمین کے کوٹھے پر جا کر کھڑے ہو گئے جہاں سے حکیم صاحب صاف نظر آ رہے تھے۔ حکیم بدھن نے آواز دے کر پوچھا۔

"سب کوٹھے پر پہنچ گئے نیچے تو کوئی نہیں ہے۔"

چودھری صاحب نے کہا "سب پہنچ گئے۔"

حکیم بدھن نے ایک لکڑی سے ایک چوڑا سا گول حصار کھینچ لیا۔ اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اس حصار میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے جیب سے

دہی بانسری نکالی اور وہی دھن شروع کی جو میں سن چکا تھا۔ بانسری کی دھن کچھ ایسی تھی کہ سب کے سب جھوم رہے تھے۔ چہار جانب ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پانچ سات منٹ گزر گئے، حکیم دھن کے اتار چڑھاؤ میں برابر تبدیلیاں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب جس حویلی میں مقیم تھے، ادھر سے ایک بھورے رنگ کا بڑا سانپ تیزی کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔ میں اور چودھری صاحب شرفو میاں کے کمرے میں دیکھ چکے تھے۔ دن میں اس کی ہیبتناکی اور بھی نمایاں تھی۔ وہ سانپ تیزی سے آیا۔ اور حصار کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھن نکالا۔ چوڑا چکلا خوف ناک پھن، اور جھومنا شروع کر دیا۔ عجیب خوفناک منظر تھا۔ حکیم بدھن کے دونوں گلے پھولے ہوئے تھے اور وہ اپنی پوری قوت سے بانسری بجا رہے تھے۔ کوئی پانچ منٹ بعد انہوں نے بانسری رکھ دی۔ سانپ کی گردش رکی۔ اب حکیم بدھن نے ماچس کی ڈبیا کھول کر اس سفید سانپ کو حصار کے باہر اس بڑے سانپ کے سامنے پھینک دیا۔ اس چھوٹے سے سفید سانپ کو دیکھ کر بڑے سانپ نے اس پر اپنا منہ مارا۔ سفید سانپ اپنے کو پھرتی سے بچا گیا اور بڑے سانپ کے قریب اس نے بھی اپنا منہ مارا۔ بڑا سانپ جلدی سے اپنے کو بچا گیا۔ اب عجیب تماشا تھا دونوں سانپ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملہ کر رہا تھا اور دونوں اپنے آپ کو بچا رہے تھے بگڑتے بنتے اور رخ پر رخ بدل رہے تھے۔ غالباً دس منٹ تک یہ مقابلہ ہوتا رہا۔

یہاں تک کہ سفید سانپ نے بڑے سانپ کی کمر پہ آخر اپنا منہ مار ہی دیا ایک تیز پھنکار کی آواز بڑے سانپ کے منہ سے نکلی۔ اور اس نے پلٹ کر سفید سانپ پر منہ مارا لیکن سفید سانپ کنی کاٹ گیا۔۔ دونوں سانپوں کی پھنکاریں ہم سب کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ سفید سانپ نے پھر بڑے سانپ کی دم پر منہ مارا۔ بڑے سانپ نے ایک تیز پھنکار بھری اور سفید سانپ پر حملہ کر دیا۔ سفید سانپ اپنے چھوٹے پن کی وجہ سے صاف بچ نکلا۔ یہ دیکھ کر بڑے سانپ نے کانپنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ چھوٹے سانپ نے اچک کر بڑے سانپ کی گردن پر منہ مارا اور منہ مارتے ہی نیچے گرا۔ اس کا نیچے گرنا تھا کہ بڑے سانپ نے چھوٹے سانپ کو اپنے منہ میں پکڑ لیا۔ سفید سانپ نے اب مسلسل بڑے سانپ کے پھن میں کاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ بڑا سانپ مضمحل ہو کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے چھوٹا سانپ چھوٹ گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بھی زمین سے اٹھنے کے لائق نہیں تھا۔ بڑے سانپ کا جسم پھڑ پھڑ کتے یکایک سرد ہو گیا۔ اور یہی حال سفید سانپ کا بھی ہوا۔ وہ بھی پھڑ پھڑ کتے سرد ہو گیا حکیم بدھن نے چیخ کر کہا۔

"مبارک ہو چودھری صاحب۔ آپ سب لوگ نیچے آسکتے ہیں۔"

ہم سب لوگ نیچے اتر آئے۔ دونوں سانپ مرے ہوئے پڑے ہوئے تھے۔ حکیم بدھن نے کہا۔

"چودھری صاحب آج سے میری توبہ ہے جو میں اس کام میں ہاتھ ڈالوں۔ پندرہ دن سے میں اللہ بہزاد کھن چکر ہو گئے وہ تو اتفاق سے یہ

سفید سانپ مل گیا ورنہ مجھے بنگال جانا پڑتا۔ اس لئے کہ یہ سانپ یہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔"

اتنے میں ٹھاکر صاحب گھبرائے ہوئے آئے ان کو دو آدمی سہارا دیئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑے سانپ کی لاش کو دیکھ کر کہا۔

"اچھا ہوا بھیا چودھری یہ مصیبت ختم ہو گئی ورنہ میری جان تو اس نے لے ہی لی تھی۔ سنا ہے شرفو بھیا بھی اس کے شکار ہو رہے تھے مجھ سے جب میری لڑکی نے کہا کہ یہ منگل اور اتوار کی رات کو بارہ بجے سانپ بن کر کہیں جاتی ہیں تو مجھے یقین نہیں آیا تھا میں سمجھا تھا کہ یہ سوتیلے پن کی باتیں ہیں۔ لیکن جب آج میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو یقین کرنا پڑا۔ تو یقین کرنا پڑا۔ یہ اس وقت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب بانسری کی آواز آئی، تو گھبرا کر اٹھی اور زمین پر لوٹنے لگی۔ یہاں تک کے سانپ بن کر میری آنکھوں کے سامنے باہر نکل گئی۔ میں اس وقت اکیلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ آ گئے تو ان کے ساتھ باہر نکلا کہ معلوم کروں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

* * *

چودھری صاحب کی مسرت کا عجب حال تھا وہ گھڑی گھڑی حکیم بڈھن کو گلے لگا رہے تھے۔ خود ٹھاکر صاحب نے بھی حکیم بڈھن کے پیر پکڑ لیے اور شکریہ ادا کیا۔ شام کے کھانے کے بعد جب میں اور حکیم بڈھن چلنے لگے تو چودھری صاحب نے ایک بند لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی بہزاد یہ آپ کی محنت کا معاوضہ ہے۔"

میں نے پوچھا "صرف میری محنت کا ہے۔ حکیم صاحب کی محنت کا تو نہیں ہے۔"

چودھری صاحب بولے "نہیں صرف آپ کی محنت کا معاوضہ ہے۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ بات تین بار کہہ دیجئے۔"

انہوں نے تین بار کہہ دیا۔

رات کے ٹھیک دس بجے جب ہم لوگ بابا صاحب کے چائے خانے پہنچے۔ چائے خانہ بھرا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک طرف کونے میں جا کر میں نے وہ لفافہ حکیم بڑھن کے سامنے کھولا۔ ایک ہزار کے نوٹ تھے۔ میں نے سو سو کے دو نوٹ الگ کرنے کے بعد باقی نوٹ حکیم بڑھن کو بڑھا دیئے۔ حکیم بڑھن بولے۔

"یہ کیا کر رہے ہو بہزاد۔ تم کو معلوم ہے کہ اس کا معاوضہ میرے لئے حرام ہے۔ میرا سارا جسم پھوٹ جائے گا۔ تمہارا کیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "یار بڑھن تم بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ رقم چودھری کی کب ہے۔ یہ تو میری رقم ہے۔ میں تم کو دے رہا ہوں۔ میں تین بار چودھری سے کہلوا چکا ہوں کہ یہ میری ہے۔ تم نے خود اپنے کانوں سے سن لیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ تم بقول خود میرے لیے سے بڑے بھی تو ہو۔"

حکیم بڑھن نے قہقہہ مارتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"تو یہ دوسری بات ہے۔"

حکیم بڈھن پر بُرا وقت آپڑا

سے چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

مرزا غالب کا پہلا مصرعہ تو عنوان واقعہ ہے اور تفصیل واقعہ ہے دوسرا مصرعہ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ پڑھیئے اور سر دھنیئے۔ اب نہ وہ دور آتا ہے نہ ویسے لوگ، نہ ویسے واقعات۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے یا نہیں کہا ہے۔

خدا دیتا ہے جب دولت امارت آ ہی جاتی ہے
تکبر آ ہی جاتا ہے رعونت آ ہی جاتی ہے

حکیم بڈھن کا واقعی یہی حال تھا وہ تو دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے تھے۔ شہر میں بھی ایک فیکٹری تھی جس کی مصنوعات خریداروں کے حسب دلخواہ ہوتی تھیں۔ ان کے مزاج کے مطابق ہوتی تھیں۔ ان کے مقام کے مطابق ہوتی تھیں۔ حکیم بڈھن میں واقعی دولت نے ایک متکبرانہ شان پیدا کر دی تھی۔ ان کی نظریں اب جس پر پڑتی تھیں انداز بدتمیزی کے ساتھ وہ لوگوں سے جب بھی ملتے تھے ان میں ایک سنجیدگی اور مخصوص ٹھہراؤ ہوتا

خریدار صاحبان بیٹھا کرتے تھے۔

حکیم نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔ اور بولے۔

"اس کو پڑھو اور مجھے اپنی رائے دو"

میں نے لفافے سے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح سے تھا۔

"پیارے پیارے پیارے حکیم بدھن! ایک دور افتادہ کا سلام قبول کرو۔ جس دن سے یہاں آیا ہوں۔ تمہاری یاد میں بے چین رہتا ہوں۔ تمہاری پیاری پیاری صحبت، تمہارے چٹکلے اور لطیفے ہر وقت یاد آتے رہتے ہیں۔ طبیعت بے چین رہتی ہے۔ اتفاقاً تم سے ملنے کی ایک سبیل نکالی ہے اور وہ یوں کہ ہفتے کی شب کو یہاں ایک نواب صاحب کے یہاں ایک مشاعرہ ہے نئے نئے گرفتار محبت ہیں۔ بارہ دن کے جشن پر ایک مشاعرہ کر رہے ہیں۔ کلکتہ کے تمام شعرائے کرام مدعو ہیں۔ میری زبانی تمہاری باتیں سن سن کر تمہارے بے حد مشتاق ہیں۔ خود ہی بولے یار آغا جانی اپنے حکیم بدھن اور ان کے ہمراہ چند شعرائے لکھنؤ کو اگر مشاعرے میں بلوالو تو واقعی مزہ آجائے۔ اخراجات کی پرواہ مت کرو۔ سیکنڈ کلاس کے کرایہ کے علاوہ انشاءاللہ ہر شاعر کو خوش کردوں گا۔ بھیا بدھن یہ الفاظ سنتے ہی میں پھڑک گیا۔ فوراً زرِ کرایہ کا مطالبہ یوں نہیں کیا کہ کہیں معاملہ اچک نہ جائے۔ اسی وقت تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں کہ اگر تم اپنے ساتھ سات آٹھ عمدہ خوش گلو شاعر لے کر آجاؤ تو مشاعرہ الگ جیت لو گے اور انشاءاللہ بے حد مطمئن اور خوش ہو جاؤ گے۔ اور ہاں ایک خوش خبری

اور سن لو۔ نواب صاحب پکے گانوں کے بہت شوقین ہیں۔ تمہاری چاندی ہی چاندی ہے۔ ایک موقع مقدر سے تمہارے ملنے کا ہاتھ آیا ہے۔ اگر آجاؤ گے تو دل خوش ہو جائے گا۔ نہیں تو مجبوری ہے۔ بہر نوع تم اتنا یاد رکھو کہ تمکو نواب نہیں آغا جانی بلا رہا ہے۔ آغا جانی۔ ہر حال میں، میں ہفتے کو صبح گاڑی پر تمہاری پیشوائی کے لئے ہاوڑا اسٹیشن پر موجود ہوں گا"

میں نے خط تمام کرتے ہی حکیم بدھن پر نظر ڈالی۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ مصلحت تو یہی تھی کہ میں اس خط کے متعلق کچھ نہ کہوں۔ لیکن میں اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ میں نے کہا۔

"یار بدھن اس خط میں کئی باتیں عجیب ہیں"

حکیم بدھن نے بے دلی سے کہا۔

"کہو۔ میں سن رہا ہوں"

میں نے کہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مشاعرے کا اتا پتا غائب ہے دوسری یہ کہ رقم کرایہ موجود نہیں ہے۔ تیسری یہ کہ خط کلکتے سے آیا ہے جہاں تمہارا جانی دشمن سہیلی موجود ہے جس کو تم نے شہر بدر کرا دیا ہے"

وہ بولے "یار بہزاد تم اختلاجی آدمی ہو۔ لہٰذا تم کو بات بات میں وہم ہو جاتا ہے۔ ارے بھائی پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ آغا جانی جب موجود ہے تو اتا پتا لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ مشاعرہ گاہ خود لے جائے گا چلئے جناب! دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ رقم کرایہ کی کوئی خاص حاجت تو ہے نہیں۔ کیا تم نے مجھے مفلس سمجھا ہے۔ تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ میں سہیلی تو کبھی

سہیں گے اچھوں سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں حکیم بڈھن ہوں حکیم بڈھن۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب درست ہے لیکن عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی تمام باتوں پر غور کرلے۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "استاد آغا جانی کے نام کے بعد کچھ سوچنا حماقت ہے۔ تم کو معلوم نہیں کہ آغا جانی سے میری دانت کاٹی روٹی تھی وہ میرا عزیز بھی ہے اور جگری دوست بھی۔ اس کے لکھنے کے بعد کچھ سوچنا سمجھنا حماقت ہے حماقت۔ اور تم بھی جاہل رہے ہو استاد۔ یہاں میری عدم موجودگی میں کچھ لوگ تم کو خراب کر دیں گے۔ آغا جانی پانچ برس سے کلکتے میں ہے۔ میں ترس رہا ہوں اس کے دیکھنے کو کمبخت کا پتا بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ آج یہ خط آیا ہے اور بس"

یہ کہہ کر حکیم بڈھن نے پرانے انداز سے ایک بلند قہقہہ مارا اور پھر بولے۔

"عابد، شگفتہ، انگو، ندیم، چھبا، مسرت اور ان کے علاوہ استاد کی حیثیت سے نواب کلن صاحب شیدا کو براہ کرم ابھی اطلاع پہنچا دو کہ شام کو وہ تمام صاحبان میرے ساتھ چائے پئیں۔ کرایے کی سائیکل لے اور بھیا ذرا جلدی سے اڑ جا تو ننھا"

چنانچہ میں اٹھ لیا اور سب کو اطلاع پہنچا کر چائے خانے تو حکیم بڈھن میرے منتظر تھے بولے۔

"یار بہزاد آنند بدھ ہے، کل جمعرات انتظام میں گزر جائے گا۔ جمعے کو صبح ہم دہرادون ایکسپریس سے روانہ ہو کر ہفتے کو باڈر صبح آٹھ بجے پہنچ لیں گے کہو پروگرام کیسا ہے"

میں نے کہا۔" اس سے بہتر پروگرام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

جمعے کو میں نماز فجر کے بعد جوں ہی گھر سے نکلا۔ میرے ہم محلہ مرزا قاسم بیگ صاحب مجھے دروازے ہی پر کھڑے ہوئے ملے۔ سے نکلا۔ میرے ہم محلہ مرزا قاسم بیگ صاحب مجھے دروازے پر ہی کھڑے ہوئے ملے اور بولے۔

"بھیا بہزاد سنا ہے تم کلکتے جا رہے ہو۔ یہ دس روپے کا نوٹ لو اور اپنی بھاوج کے لیے عمدہ قسم کی دو ساریاں سیاہ اور لال بارڈر والی ضرور لیتے آنا۔"

میں نے وہ نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ اور چل دیا۔ میرے ساتھ سازوسامان میں صرف ایک بٹوا تھا جس میں چھالیا، کتھا اور تمباکو تھا باقی گاڑھے کا ایک جبہ تھا جو میں پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا مشاعرے کے لیے حکیم بدھن نے اپنا ایک کرتا اور پاجامہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ چائے خانے میں تمام شعرائے کرام ناشتہ فرما رہے تھے۔ میں بھی ناشتے پر بٹھا دیا گیا۔ سب حضرات کے ساتھ ایک ایک اٹیچی اور ہولڈال تھا۔ حکیم بدھن حسب دستور چیسٹر پہنے ہوئے تھے جا بدانی کا انگرکھا۔ دو پلی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ ڈپیٹ۔

ٹھیک سات بجے تانگے آگئے اور شعرائے کرام کا قافلہ اسٹیشن روانہ ہو گیا میں حکیم بدھن کے ہمراہ تھا۔ حکیم بدھن نے راستے میں مجھ سے کہا۔

"یار بہزاد تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید لینا۔ میرے پاس بیس روپے ہیں۔ اور خدا کا نام۔"

"میں نے کہا۔" واپسی کا کرایہ انسان کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔"

"وہ بولے "یار پھر وہی وہی باتیں۔ میاں آغا جانی کے نام کے بعد کچھ سوچنا سمجھنا حماقت ہے۔

میں خاموش رہا۔ اسٹیشن پہنچ کر ساڑھے چھ روپے فی ٹکٹ کے حساب سے میں نے نو ٹکٹ خریدے اور آٹھ روپے حکیم بڈھن کے حوالے کر دیے۔ حکیم بڈھن نے ان روپوں سے تانگوں اور قلیوں کو ادا کیا۔ پندرہ منٹ کے بعد دہرہ ایکسپریس آ گیا۔ ایک تھرڈ کلاس میں شعرائے کرام کے بستر کھل گئے۔ تاشوں کی گڈیاں نکل آئیں۔ کوٹ پیس شروع ہو گیا۔ نواں آدمی میں ہی فالتو تھا جو کھڑکی سے لگ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دوپہر کا کھانا حکیم بڈھن کے ساتھ تھا۔ ٹھنڈے کباب اور پراٹھے۔ دن بھر تاش ہوتے رہے۔ شام ہوتے ہی حکیم بڈھن نے راگ داری شروع کر دی۔ مجھے حیرت تھی کہ ان شعرائے کرام میں ہر شخص موسیقی کا ماہر نظر آ رہا تھا۔ ہم پہ سب کی گردنیں جھٹک رہی تھیں۔ حکیم بڈھن کی تان کے وقت سب کے چہرے تن رہے تھے اور گردنیں بل کھا رہی تھیں۔ صرف ایک میں تھا جو کوفت کھا رہا تھا۔

آٹھ بجے گاڑی گیا پہنچی۔ یہاں حکیم بڈھن نے کھانا خریدا۔ اور شعرائے کرام کھانے میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً بارہ بجے سب سو گئے۔ سوائے میرے مجھے چلتی گاڑی میں نہ جب نیند آتی تھی اور نہ اب آتی ہے۔ تمام شب جاگتا رہا۔ صبح شعرائے کرام کو بیدار کیا۔ بردوان میں چائے اور ناشتہ ہوا۔ اور ٹھیک ۸ بجے صبح ہاوڑا اسٹیشن میں گاڑی داخل ہوئی۔ حکیم بڈھن فوراً پلیٹ فارم پر اتر کر آغا جانی کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اسٹیشن پر بے پناہ ہجوم تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ سے تمام شعرائے کے اینچی اور ہولڈال پلیٹ فارم پر اتار کر رکھ لیئے۔ شعرائے کرام اپنے چہروں اور کپڑوں کی دیکھ بھال میں تھے کھڑے کھڑے آدھ گھنٹا گزر گیا۔ مجمع بھی تقریباً چھٹ گیا۔ لیکن حکیم بڑھن کہیں نظر نہ آئے۔ میں ڈھونڈنے جانے ہی والا تھا کہ حکیم بڑھن آتے ہوئے نظر آئے میں نے دیکھا کہ چہرہ پریشان تھا۔ مجھے ایک طرف علیحدہ لے جا کر بولے۔

"یار بہزاد تم سچ کہتے تھے چوٹ ہو گئی۔ یہ سب سہیل کا انتقام ہی نظر آرہا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ میں نے تمہاری بات سنی اور غور نہ کیا۔ میرے پاس اب صرف ایک روپیہ رہ گیا ہے۔ آخر مسافر خانے کیوں کر پہنچا جائے"

میں نے کہا "میرے پاس امانت کے دس روپے موجود ہیں تم لے سکتے ہو۔ مجھ سے دو سواریاں منگائی گئی تھیں۔ میں بھگت لوں گا"

وہ خوش ہو گئے اور بولے "تو یار بہزاد کام بن گیا۔ کوئی پرواہ نہیں ہے۔ لاؤ دس کا پتا نکالو"

میں نے نوٹ پکڑا دیا۔ قلی بلوا کر سامان اٹھوایا گیا۔ اسٹیشن سے نکل کر آدمی والے رکشے پر دو دو شاعر بیٹھ گئے۔ اور نا خدا کے مسافر خانے چل دیئے۔

مسافر خانے میں شعرائے کرام کی سج دھج اور حکیم بڈھن کی باتوں نے کام بنا لیا۔ ایک بڑا کمرہ ہم نو آدمیوں کو مل گیا۔ اس کمرے میں پلنگ مفقود تھے۔ زمین پر بستر کھل گئے۔ شعرائے آرام سے دراز ہو گئے مجھے لے کر حکیم بڈھن باہر نکلے اور بولے۔

"یار بہزاد! یہاں میرے جاننے والے نکل تو آئیں گے لیکن ہاتھ پھیلانا حکیم بڈھن کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

میں نے کہا "اور زادِ کرایہ کے علاوہ یہاں کے اخراجات کا کیا ہوگا؟"

وہ بولے "ہاں یہ کہتے ہو۔ تقریباً سو روپوں کی ضرورت ہے گھبراؤ نہیں اللہ مالک ہے۔ ایک کام کرو۔ میں تمہیں دو روپے دے رہا ہوں کسی عطار کے ہاں سے یہ دوائیں لے کر وہیں کھرل میں پسوا لو اور مسافر خانے میں دوپہر تک آجاؤ۔"

میں کچھ سمجھا تو نہیں لیکن چلا گیا۔ زکریا اسٹریٹ پر ایک عطار سے میں نے دو روپے کی دوائیں لیں اور وہیں ہاون دستے میں کٹوا کر چھنوا کر اس سفوف کو لے کر جب مسافر خانے پہنچا تو ایک بج رہا تھا۔ حکیم بڈھن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"یار بیٹھو بیٹھو۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔ کھانا آرہا ہے۔"

سامنے کے ہوٹل سے چنے کی دال گوشت اور گرم گرم تندوری روٹیاں آگئیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھومر۔ مزہ آگیا۔ کھانے کے بعد حکیم صاحب اور میں اس سفوف کی پڑیاں بنانے لگے اور شعرائے کرام نے تاش بازی شروع کر دی۔ تقریباً ساڑھے چار بجے حکیم بڈھن نے شعرائے کرام سے کہا۔

"حضرات! میں آپ سب کا ممنون ہوں کہ آپ نے باوجود کچھ جگہ جانے کے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ حضرات کو مجھ پر

اعتماد کیا ہے جس کا میں بے حد ممنون ہوں اور انشا اللہ اس اعتماد کو شکست نہ ہونے دوں گا۔ واقعی میں مکمل دھوکا کھا گیا۔ یہاں کوئی شاعر و شاگرد نہیں ہے۔ مجھ سے انتقام لیا گیا ہے۔ جسے بہزاد نے روکا تھا لیکن میں نے اس وقت کی بات نہ مانی۔ میں ایک بات اور بتا دوں۔ واپسی کا کرایہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن آپ حضرات گھبرائیں نہیں مجھ پر اعتماد رکھیں انشا اللہ کوئی تکلیف آپ حضرات کو بجز اس کے نہیں ہو گی کہ آپ حضرات شعر خوانی نہ کر سکیں گے۔ براہ کرم آپ سب حضرات سوائے بہزاد کے شہر گھومنے چلے جائیں اور مغرب سے قبل تشریف نہ لائیں۔ یہ ایک روپیہ ٹرام کے کرایہ کے لئے نذر ہے۔ یہ پھر ملحوظ رہے کہ مغرب سے قبل تشریف لایئے گا۔ کمرہ بند ملے گا۔"

میں نے دیکھا شعرائے کرام کے چہرے اتر گئے لیکن سب کے سب خاموش رہے۔ نواب کلن صاحب کے ہمراہ یہ سب حضرات گھومنے کے لئے نکل گئے۔ نواب کلن صاحب پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے۔ اور مٹیا برج میں ان کے اعزا بھی موجود تھے۔

شعرائے کرام کے جاتے ہی حکیم بدھن نے کہا۔

"بہزاد تم میرے دوست ہو۔ لہذا تمہارے ساتھ کوئی حرکت کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو گا۔ چلو مسجد کے پیچھے مجمع لگتا ہے پڑیاں سنبھالو۔" تم نے پڑیاں سنبھال لیں۔ کئی سو تھیں۔ میں نے کہا "تم مجمع لگاؤ گے؟" حکیم بولے۔ "یار نخاس میں ہر اتوار کو دوا فروش مجمع لگاتے ہیں میں نے

ان کو سنا ہے اور بغور سنا ہے۔ ان کی ترکیبیں کبھی نہ چوکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار میں بھی کوشش کرتا ہوں"۔ میں خاموش ہو رہا مجھے یقین نہیں تھا کہ حکیم بدھن مجمع لگا سکے گا۔ مسجد کے پہنچتے ہی دو پڑیاں ایک طرف ڈھیر کر دیں اور بالکل ایکٹروں کے انداز میں زور سے کہا۔

وہی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

حکیم بدھن کی پاٹ دار آواز نے فوراً کام کیا۔ چاروں طرف سے لوگ آ آ کر حکیم بدھن کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ حلقہ لگ رہا تھا اور حکیم بدھن عجیب عجیب اشعار پڑھ کر مجمع کو بلا رہے تھے۔ جب مجمع کافی تعداد میں جمع ہو گیا تو حکیم نے کہا۔

"حضرات! میں کوئی بازاری حکیم نہیں ہوں بلکہ خاندانی طبیب ہوں میرے باپ دادا، پردادا سب کے سب حکیم تھے اور نامی گرامی حکیم۔ آپ میرے لباس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں بازاری آدمی نہیں ہوں۔ ریل کے سفر میں میری جیب کٹ گئی اور آج جب پہنچا ہوں تو میرے پاس چند روپیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لیکن میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ چرانے والا میرا فن اور میرا علم نہیں لے جا سکا۔ میرے پچاسوں جاننے والے یہاں اسی کلکتے میں موجود ہیں۔ میں چاہوں تو ان سے ضرورت کے مطابق روپے مانگ سکتا ہوں لیکن ہاتھ پھیلانا شرافت کے سخت خلاف ہے۔ میں نے اپنی خاندانی بیاض سے ایک نسخہ نکالا۔ اس کو تیار کیا جو ان پڑیوں کی شکل میں

آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ وہ دوا ہے جس کو شاہانِ اودھ نے استعمال کیا ہے اور شاہانِ دہلی اس کے گرویدہ رہے ہیں اس لئے کہ اسکے استعمال سے پیٹ کی تمام شکایات قطعاً دور ہو جاتی ہیں۔ ایک ہی خوراک اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ میرے پاس اس کی صداقت کے لئے بجز اس کے اور کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آپ صرف دو آنے خرچ فرما کر اس کا امتحان کر لیجئے۔ کھٹی ڈکاریں پیٹ کا پھولنا، قے، متلی۔ غرض معدے سے پیدا ہونے والی ہر بیماری کا واحد اور فوری علاج ہے قیمت فی پڑیا دو آنے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو خرید لیں"

مجھے حیرت ہو گئی جب تمام مجمع بے قراری کے ساتھ پڑیوں پر ٹوٹ پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں تمام کی تمام پڑیاں بک گئیں۔ سامنے سوائے دونیوں کے ڈھیر کے اور کچھ نہ رہا۔ حکیم بڈھن کے اشارے پر میں نے رومال میں وہ دونیاں بھر لیں۔ مغرب ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ حکیم بڈھن نے دونیاں گنیں پچیس روپے کی تھیں۔ میں نے جا کر وہ دونیاں دوکاندار کو دیدیں اور ان کے روپے لا کر حکیم بڈھن کے حوالے کئے۔

حکیم بڈھن نے کہا۔ "استاد دیکھا۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

تین شعرا کے بھیجنے کے روپے تو آ گئے۔ آگے اللہ مالک ہے"

اتنے میں تمام شعرائے کرام گھوم کر واپس آ گئے۔ ان کے آنے کے بعد

اتنے کے بعد معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا، لیکن کرتے تو کیا کرتے۔"

ماسٹر نثار نے کہا۔ "تو لکھنؤ واپسی کے لیے پریشانی ہو گی"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "ہاں ہے۔ لیکن اللہ مالک ہے۔"

ماسٹر نثار نے کہا۔ "حکیم صاحب تم کو یہودن کی لڑکی میں شمعون یہودی کا پارٹ یاد ہے کہ نہیں۔ لکھنؤ میں مجھے یاد ہے کہ تم اس پارٹ کو میرے ساتھ بیٹھ کر یاد کیا کرتے تھے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "یار حرف بحرف یاد ہے اور اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ ماسٹر منصف سے کم نہیں کروں گا، اگر موقع مل جائے۔"

ماسٹر نثار نے کہا۔ "چلو منظور۔ پچیس روپے شب کے حساب سے میں تمہارا معاملہ اس کمپنی میں کرائے دیتا ہوں۔ تین برابر یہودی کی لڑکی کا تماشا ہو رہا ہے اور شمعون کا پارٹ جو ایکٹر کرتا ہے اس کے گھر سے تار آیا ہے اس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ گھبرایا ہوا ہے۔ کل میں تم کو لینے کے لیے دن میں آؤں گا دن کی ریہرسل میں تم کام کر لو۔ اگر ڈائریکٹر مطمئن ہو گیا تو کام بنا ہوا سمجھو۔"

ان لوگوں سے رخصت ہو کر ہم مسافر خانے پہنچے۔ شعرائے کرام کچھ افسردہ سے تھے۔ حکیم بڈھن نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"آپ حضرات پریشان نہ ہوں۔ آج کے چوتھے دن انشاء اللہ یہاں سے واپسی ہو گی۔ روپیہ کا انتظام ہو گیا ہے۔"

رات سونے سلانے میں کٹ گئی۔ صبح نو بجے حکیم بڈھن کو لینے ماسٹر نثار

آ گئے۔ میں نہیں گیا۔ قریب چار بجے حکیم بڈھن آئے اور بولے۔

"بھیا بہزاد کام ہو گیا۔ یہ پاس لو۔ اور آج رات کو تم پنڈال میں آ کر اپنے حکیم بڈھن کا یہ نیا کارنامہ بھی دیکھ لو۔ کیا یاد کرو گے کہ کسی صاحب فن سے پالا پڑا تھا"

میں ٹھیک نو بجے پنڈال پہنچا۔ میری معمولی پوشاک پر گیٹ کیپر نے ناک بھوں تو چڑھائی۔ لیکن مجبور تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے تماشا شروع ہو گیا۔

شمعون یہودی کے روپ میں جب حکیم بڈھن رونما ہوئے تو میں پہچان نہ سکا۔ حکیم بڈھن نے جب اپنے خصوصی انداز میں ہاتھ اٹھایا تو میں سمجھا۔ سبحان اللہ حکیم بڈھن نے واقعی کمال کر دیا اور اپنا پارٹ خوب ادا کیا۔ ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ ان کے ہاتھ پیر دل کے پھینکنے کا انداز ایسا قدرتی معلوم ہو رہا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ حکیم بڈھن ہو سکتا ہے۔ ایک منجھا ہوا اور مشاق ایکٹر اگر کرتا تو ایسا ہی کرتا حکیم صاحب کے پارٹ پر مسلسل تالیاں بجتی رہیں۔ تماشا آخر رات میں دو بجے ختم ہوا۔ میں حکیم بڈھن کے انتظار میں ٹھہر گیا اور ڈھائی بجے کے قریب وہ نکلے تو میں اور حکیم دونوں مسافر خانے واپس آئے۔ میری تعریف پر حکیم بولے۔

"بھیا بہزاد مجھے بچپن سے اس کا شوق رہا ہے۔ تقریباً میں نے ایکٹنگ کی مشق کی جو اس وقت میرے کام آ گئی"

❊ ❊ ❊ ❊ ❊

تین دن باتوں ہی باتوں میں گزر گئے۔ شعرائے کرام اور میں دن بازاروں کی تفریح کرتے تھے۔ اور حکیم بدھن غریب رات بھر جاگتا اور دن بھر سوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان تین دنوں میں اس کا چہرہ اتر گیا ہے چوتھے دن حکیم نے مجھ سے کہا۔

"یار بہزاد اب کل روانگی کا ارادہ ہے۔ تم ذرا اسٹیشن پر جاکر گاڑی کا وقت تو معلوم کر آؤ۔ روپے مجھے کل رات ہی مل گئے ہیں"

میں پیدل ہی ہاوڑا اسٹیشن جا رہا تھا کہ راستے میں حضرت مست غازی پوری مل گئے کلکتے کے بہترین شاعر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

ارے بھائی بہزاد کب آئے اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

میں نے مست کو ساری روداد سنائی۔ حکیم بدھن کے کمانے والا معاملہ بھی گول کر گیا۔

وہ بولے۔ "بھائی بڑا افسوس ہوا جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے بہت برا کیا ہے۔ آج رات کو یہاں ایک طرحی مشاعرہ ہے اور بڑے پیمانے پر ہے۔ وہ بھی ایک نواب کے یہاں سے کیوں نہ اس میں تم مع دیگر شعرائے کرام کے شریک ہو جاؤ۔ تمہارے لکھنؤ کے ہمیلی بھی موجود ہیں۔ میں تم کو نواب صاحب کی طرف سے دعوت دے رہا ہوں !!

میں راضی ہو گیا۔ مسافر خانے آنے کے بعد میں نے طرح پر آٹھ غزلیں لکھیں ایک اپنے لئے بقیہ سات شعرائے کرام کے لئے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مست غازی پوری دو کاریں لے کر مسافر خانے

آئے اور ہم سب کو لے کر مشاعرہ گاہ پہنچے۔ یہ مشاعرہ چورنگی کی ایک عالیشان بلڈنگ کے ہال میں تھا۔ ہم لوگ جوں ہی پہنچے ایک مولانا سے بھاری بھرکم آدمی ہماری پیشوائی کو دروازے پر موجود ملے۔ مست نے ان کا تعارف کرایا یہ صاحب خانہ نواب صاحب تھے۔ نواب صاحب ہم سب کو لئے ہوئے ایک بڑے ہال میں پہنچے جہاں اور تمام شعرائے کرام موجود تھے۔ صرف ہم لوگوں کا انتظار تھا۔ ہمیں خصوصی مقام پر بٹھانے کے بعد نواب صاحب نے کہا۔

"حضرات جن مہمانوں کا انتظار تھا وہ تمام کے تمام تشریف لے آئے ہیں۔ حضرات گرامی! مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کو کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے شہر کے کسی غیر ذمہ دار اور چھچھورے آدمی نے ایک خط بھجوا کر ایک فرضی مشاعرے کے لئے سات شعرائے کرام۔ ایک استادِ فن اور طبیب کامل کو مدعو کیا۔ ان حضرات نے زر کرایہ نہ پہنچنے پر بھی تشریف ارزانی فرمائی۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کو مشکلات اور بے آرامیوں کا کافی سامنا کرنا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج مجھے جناب مست خانہ کی پوری کے ذریعے اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ملی۔ میں نے ان حضرات کو دعوت دی اور ان حضرات نے قبول فرما کر مجھے تمام ملک نے کو عزت بخشی اور ساتھ ہی ساتھ صرف ایک دن کی کم مدت میں طرحی غزلیں ارشاد فرما کر تشریف لے آئے۔ میں تمام حضرات کلکتہ کی طرف سے ان حضرات سے معافی کا طالب ہوں اور ان کی بے آرامیوں اور پریشانیوں پر اظہارِ شرمندگی کر رہا ہوں مجھے امید ہے کہ یہ حضرات معاف فرما دیں گے۔ اور حسب تحریر خط ان حضرات کی خدمت میں کرایے کی ناچیز

رقم پیش کرنے کی سعادت مشاعرے کے بعد حاصل کروں گا۔ میں کہنا بھول گیا کہ ان حضرات کو آغا جانی نام کے ایک شخص کے نام سے دھوکا دیا گیا وہ شخص دو برس ہوئے رنگون جا چکا ہے۔ ہاں حضرات بسم اللہ۔

مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ لکھنؤ کے تمام شعراء کامیاب رہے۔

استاد کلن شیدا کی غزل خوب چلی۔

مشاعرے کے خاتمے پر میں نے مست صاحب سے پوچھا۔

"یار سہیل نظر نہیں آیا۔

مست نے جواب دیا "قبل مشاعرہ موجود تھے۔ تقریر کے دوران اٹھ کر چلے گئے"

حکیم بڈھن نے آسمان میں

دشمنوں سے مقابلہ کیا

بڈّا صاحب کے چائے خانے میں حکیم بڈھن کی شاعر فیکٹری روزانہ صبح ۶ بجے پابندیٔ وقت کھلتی تھی اور رات کے ٹھیک آٹھ بجے بند ہو جاتی تھی۔ ایک کاریگر کی حیثیت سے میری ڈیوٹی تو ختم ہو جایا کرتی تھی پنسل اور کاغذ دراز میں بند ہو جاتے تھے۔ لیکن ایک مصاحب کی حیثیت سے میں اس وقت تک گھر نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ فیکٹری کے مینیجنگ پروپرائٹر حکیم بڈھن خود نہ گھر کو روانہ ہو جائیں۔ مجھے اس ڈیوٹی سے کوفت بے حد ہوتی تھی لیکن دو روپے روز کا لالچ پابند کئے ہوئے تھا گھر کا کھانا مجھے کبھی قسمت سے ہی نصیب ہو جایا کرتا تھا ورنہ صبح سے دن بھر تک چائے پیتے پیتے اگر تمباکو کی بھوک باقی رہتی تو حکیم صاحب کے خوانِ نعمت میں شریک ہو جاتا تھا۔ وہی کیفیت رات کے کھانے کی بھی ہوتی تھی۔ دن بھر کی چائے نوشی نے بجائے خون کے میری رگ رگ میں چائے دوڑا دی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی اس کیفیت پر ایک مطلع بھی لکھ لیا تھا۔

چائے پیتا ہوں آہ کرتا ہوں - زیست سے یوں نباہ کرتا ہوں

دن گزر رہے تھے۔ دن بھر شعر و شاعری کے ساتھ، رات حکیم بدھن کے قہقہوں کے ساتھ۔

تقریباً دو ماہ سے مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں فیکٹری بند نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ مجھے روزانہ آنے والے گاہک ہفتوں نظر نہ آتے تھے مقامی شاعر بھی غائب ہونے لگے تھے۔ وہ گہما گہمی جو میں عرصے سے دیکھ رہا تھا وہ بالکل جمود میں بدل گئی تھی۔ فیکٹری بند ہونے کے خیال سے مجھے اپنی بیکاری کا دھیان آنے لگتا تھا۔ میری اضطرابی کیفیتیں ایسی تھیں جن کو کوئی ادارہ کوئی فرم پسند نہیں کر سکتی تھی۔ سرٹیفکٹ اور قابلیت کس کام کے جب آدمی پرسکون نہ ہو۔

دو ماہ سے میں تقریباً ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ طبیعت بھی گھبراتی تھی۔ خود ساختہ زمینوں میں بغیر فرمائش غزلیں لکھ لکھ کر دراز میں رکھ لیتا تھا تاکہ مشق قائم رہے۔ لیکن پھر بھی قلب میں آنے والی بیکاری کا خوف برابر رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ گھڑی آ ہی گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ میں ٹھیک ۸ بجے صبح چائے خانے پہنچ گیا۔ میرے لئے حسب معمول مقرر شدہ ناشتہ میز پر پہنچ گیا۔ میں ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ حکیم بدھن خراماں خراماں چائے خانے میں داخل ہوئے اور اپنی میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے چہرے پہ نظر ڈالی، وہ کچھ متفکر نظر آ رہے تھے۔ جوں ہی میں نے ناشتہ ختم کیا ان کی آواز بلند ہوئی۔

"بھیا بہزاد! ذرا میری میز پر تو آجاؤ۔"

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کی میز پہ پہنچا۔ میرے بیٹھنے کے بعد بولے۔

"بھیا! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ رہے ہو لیکن کیا کروں۔

بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر"

میں نے کہا۔ "جو کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالیے مجھے تکلیف نہیں ہوگی۔ میں دو ماہ سے اسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔"

وہ بولے۔ "اور تم صحیح نتیجے پر پہنچے۔ تم کو اس کا علم ہے کہ فیکٹری کی آمدنی بالکل بند ہے۔ گویہ بندش سیاسی اکھاڑے بازیوں کی بنا پر ہے جن کو ایک آدھ ماہ میں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس تعطل کے بعد جو دور آئے گا۔ اس میں شاید مجھے اور تمہیں سر اٹھانے کی بھی مہلت نہ ملے۔ لیکن......"

میں نے کہا۔ "لیکن کیا؟ صاف صاف کہو۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بات صاف ہے۔ مجھے فیکٹری آج سے نہیں تو کل سے بند کرنا ہوگی۔ لیکن تم برابر آسکتے ہو۔ اور انشا اللہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا......"

میں نے کہا۔ "میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بھائی حکیم بڈھن میں محنت کی روٹی کھانے کا قائل ہوں۔"

وہ بولے "آخر میرے تمہارے تعلقات بھی تو ہیں۔ افسوس کہ میں اپنی بے حد معقول آمدنی میں سے کچھ پس انداز نہیں کر سکا۔ میں نے غلطی کی ورنہ یہ جھٹکا دو رہ بہ آسانی گزر جاتا۔ اور اگر اللہ میاں نے آج ہی کوئی سبیل نکال دی تو کل بھی فیکٹری کھلے گی بند نہیں ہو گی۔ میں اللہ سے مایوس ہونیکا قائل نہیں ہوں"!

میں اس گفتگو کے بعد اپنی میز پر چلا آیا۔ آنے والی کل کی پریشانیاں مضطرب کرنے لگیں۔ جب مینجنگ پروپرائٹر ہی کے پاس کوئی سرمایہ محفوظ نہیں تھا تو مجھ کاریگر کے پاس کیا امکان تھا۔ کسی اور جگہ ملازمت کی نہ تو کوئی امید تھی اور نہ کوئی صورت۔ میں نے کاغذ پنسل نکال کر غزل لکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کچھ عجیب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ جب میں اپنے خیالات سے چونکا تو چائے خانے کا گھنٹا بارہ کا گجر بجا رہا تھا۔ حکیم بڈھن اور بابا صاحب میں کچھ تناتنی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بابا صاحب نے یکایک مجھے آواز دی۔

"بھائی بہزاد! ذرا ادھر آ کر حکیم صاحب کو سمجھاؤ۔"

میں اپنی میز چھوڑ کر حکیم صاحب کی میز پر پہنچا تو مجھے دیکھ کر بابا صاحب نے کہا۔

"بھیا دیکھو، آج پورے دو مہینے ہو رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے چائے خانے کا حساب صاف نہیں کیا ہے۔ میں مانگ رہا ہوں تو بگڑ رہے ہیں۔"

ہم نے پوچھا "کتنی رقم ہے؟"

وہ بولے "پورے دو سو پینتیس روپے چھ آنے ہیں اب تک، اور بھی

شام تک کتنی رقم خدا جانے اور بڑھ جائے ۔"

میں نے کہا ۔ جہاں تک میرا خیال اور علم ہے حکیم صاحب نے آپ کو پانچسو روپے تک پیمنٹ ادا کئے ہیں ۔ پھر آپ اس کم رقم کے لئے کیوں پریشان ہیں ؟"

وہ بولے "یار عجیب باتیں کرتے ہو ۔ مجھے خود ہی بلا کر بولے ۔ کہ کل سے میں فیکٹری بند کر رہا ہوں ۔ نہ بہزاد آئیں گے اور نہ ہم ۔ پھر آخر میں صبر کیوں کروں ۔ فیکٹری جاری رہتی تو میں بھی خاموش رہتا ۔

میں نے کہا ۔ فیکٹری اگر بند بھی ہو جائے گی ۔ تو حکیم بدھن آپ کی کوڑی کوڑی ادا کر دیں گے ۔ آپ اطمینان رکھیے ۔ اس وقت وہ خود پریشان ہیں آپ کا اصرار اور ان کو غصہ دلا رہا ہے اور کوئی بات نہیں ہے ۔

ببّا صاحب میری بات سے لاجواب ہو کر اپنی میز پر چلے گئے ۔ یکایک بھلّن صاحب اپنی بڑی بڑی مونچھوں سمیت چائے خانے میں داخل ہوئے اور حکیم بدھن کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے ۔

" یار حکیم صاحب چائے بلواؤ اور کوئی مشورہ دو ۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں "

بھلّن صاحب حکیم صاحب کے مخصوص گاہک اور پرانے دوست تھے ۔ حکیم صاحب نے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے پوچھا ۔

"خیریت تو ہے بھائی بھلّن صاحب ؟"

بھائی بھلّن بولے ۔ خیریت ہے بھی اور نہیں بھی "

حکیم صاحب نے کہا "یار صاف صاف بتاؤ۔ یہ معموں والی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آتی"

بھتن صاحب نے کہا۔ تم نواب بنّن سے واقف ہو یا نہیں"

وہ بولے "کون نواب بنّن۔ چرملی کا غلام ۔۔؟

بھتن صاحب نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یار ہم لوگوں نے جو مذاق میں پھبتی کسی تھی وہ اب اس مشہور ہو گئی ہے کہ لوگ غریب کا نام بھی بھول گئے ہیں۔ ہاں وہی چرملی کا غلام! آج اس کی عزت پر بنی ہوئی ہے۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ کیونکر اسکی عزت بچائی جائے"

حکیم بڈھن نے کہا "یار کچھ منہ سے پھوٹو بھی یا یوں باتیں بنانے رہ گئے"

بھتن صاحب نے جواب دیا۔

"بھیا ذرا تفصیل سے بات سمجھنا پڑے گی۔ لیکن سمجھ جاؤ گے۔ محمد علی شاہ کی بادشاہت کے وقت سے دو خاندانوں میں دشمنی آج تک چلی آ رہی ہے اور ان دونوں خاندانوں میں ایک نواب بنّن عرف چرملی کے غلام کا خاندان ہے اور دوسرا نواب جانی صاحب کا"

حکیم بڈھن بولے "اچھا تو پھر۔ بات تو بتاؤ میں دونوں کو جانتا ہوں"

بھتن صاحب نے چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

تین بادشاہتیں گزر گئیں۔ اب انگریزی دور ہے لیکن ان دونوں

خاندانوں کی دشمنیاں کسی صورت ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ تم کو شاید معلوم نہیں ہے کہ تمہاری بھاوج نواب بنن کی چچازاد بہن ہیں، مجھے اس وجہ سے بنن کا بے حد خیال ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "یار اصل معاملے پر آؤ۔ تم تو تفصیل میں پڑے ہوئے ہو۔"

بھلّن صاحب بولے۔ "بغیر تفصیل کے تم خاک سمجھو گے۔ ارے میاں بنن کے آباؤ اجداد اسی جھگڑے کے باعث تباہ ہوتے رہے اور یہاں تک کہ اب بنن صاحب کو ورثے میں معمولی سا وثیقہ نصیب ہوا ہے اگر اسکی ننھیالی جائداد نہ ہوتی تو وہ یہ معمولی نوابانہ شان بھی برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ اس کے برخلاف نواب جانی صاحب کا وثیقہ بھی بہت کافی ہے اور ان کا روپیہ بھی مختلف تجارتوں میں لگا ہوا ہے۔"

حکیم بڈھن نے اس تفصیل سے جل کر کہا۔

"پھر۔ پھر۔ پھر۔"

بھلّن صاحب بولے۔ "یار مطلب پر آرہا ہوں۔ پہلے تفصیل سمجھ لو۔ بنن عرف چڑی کا غلام مالی حالت سے کمزور ہے اور ذرا عقل سے بھی کورا ہے۔ نواب جانی ایک ہی متفنی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مالدار بھی۔ یوں سمجھ لو ایک بلّی اور ایک چوہے کا مقابلہ ہے۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بھلّن صاحب سمجھ لیا۔ سمجھ لیا۔ سمجھ لیا۔ اب اصل پر آئیے۔"

چھٹن صاحب نے جواب دیا۔

"معاملہ یوں ہے کہ نواب بدنے ایک تیسرے آدمی کے پردے میں نواب بنن سے کنکوے کا میدان بد لیا۔ جو آج صبح سے ہو رہا ہے۔ دو دو پیچ اور دو سو تو تیر داں اتارنے کی شرط ہے۔ نواب بنن غریب کو اصل صورت کا علم نہیں تھا۔ نواب جانی نے شہر کے بہترین کنکوے باز آج کے لئے اپنے یہاں مدعو کر لئے اور ان کو فیسیں بھی دیدیں۔ بہترین گھر یہ ستہ اکہ تیار کی۔ غریب بنن اس حال سے قطعی بے خبر تھا وہ خود کنکوا اچھا لڑا لیتا ہے۔ لہذا مطمئن تھا۔ کل رات نواب جانی نے بنن کو اطلاع دلوائی کہ میں نے کل کا میدان حشمت سے خرید لیا ہے۔ لہذا صبح میرا تمہارا مقابلہ ہے۔ غریب بنن ہکا بکا رہ گیا اور فوراً مجھے بلوایا۔ رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں گھبرایا ہوا پہنچا تو حقیقت حال معلوم ہوئی۔ لیکن بجز افسوس اور کیا ہو سکتا تھا بہر نوع مقابلہ تو ہونا تھا۔ آج صبح سے ایک جانب گومتی کے کنارے نواب جانی کا کیمپ لگا ہوا ہے اور دوسری جانب غریب بنن کا۔ نواب جانی کے کیمپ میں دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ شہر کے بہترین کنکوے باز جمع ہیں، ناچ رنگ کا سامان بھی ہے۔ ماسٹر راحت کا طائفہ بھی آیا ہوا ہے۔"

حکیم بدھن نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اور ادھر نواب بنن کے وہاں کیا حال ہے؟"

چھٹن صاحب نے کہا۔ "حال کیا ہے۔ غریب کا چہرہ اترا ہوا ہے صبح سے کوئی ایک گھنٹا پہلے تک بنن کی طرف سے جو بھی کنکوا بڑھا وہ

کٹا ہی ہے۔ غریب بنن نے بمشکل خود دس یا پندرہ کنکوے کاٹے ہیں۔ انکی طرف کل پانچ چھ لڑانے والے ہیں اور وہ بھی ان لوگوں کے مقابلے میں نہ سیکھتے۔ مجھے خوشامد کرکے بنن نے فضلو کو لینے کے لئے بھیجا تھا۔ فضلو ہی ایسا کنکوے باز تھا جو ادھر اب تک شریک نہیں تھا۔ گھسیٹ کے بیچ اس سے بہتر لڑانے والا شہر میں نہیں ہے۔ میں ابھی اسی کے پاس سے آرہا ہوں۔ غریب مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔ ابھی ابھی جانی صاحب کا آدمی پچاس روپے دیکر بلا گیا ہے۔ اگر آپ ذرا پہلے آگئے ہوتے تو میں نواب بنن کی طرف سے لڑتا اب مجبور ہوں۔"

حکیم بڈھن نے کہا۔ اس کا حشر کیا ہوگا۔"

بھلن صاحب بولے۔ "حشر کیا ہوگا؟ بنن کی تباہی اور ذلت۔ شام تک دیکھو کتنا ہار کر روپیا دینا پڑے اور وہ بھی فوراً۔ دوسرے فریق مخالف کی طرف سے کتنے آوازے توازے سننا پڑیں گے۔ اب تم رائے دو کہ کیا ترکیب کی جائے؟"

حکیم بڈھن نے کہا۔ "بھائی بھلن صاحب قصور معاف! مجھے بذاتہ بنن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے تمہاری ہی طرف سے بنن کو اپنی فیکٹری کا خریدار بنانا چاہا تھا تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن مظلوم کی امداد بھی فرض ہے۔ میں چل رہا ہوں۔ چلو بہرانا!"

بھلن صاحب بولے۔ "یار تم چل کر کیا کروگے۔ کیا خود پیچ لڑاؤ گے؟ میں نے تم کو کبھی سنا نہیں کہ تم کنکوا بھی لڑا لیتے ہو۔"

حکیم بدھن بولے "ان باتوں سے کیا فائدہ ہے۔ تم خود دیکھ لینا میں کرتا ہوں۔ چلو بہزاد۔ رک کیوں رہے ہو۔ آج پھر فیکٹری باقی ہے اور تم فیکٹری کے کاریگر ہو۔"

میں با دلِ نخواستہ ساتھ ہو لیا۔ ہم تینوں تانگا پر بیٹھ کر گومتی کے کنارے پہنچے۔ واقعی نواب جانی کے کیمپ میں جشن ہو رہا تھا۔ ماسٹر راحت لہک لہک کر غزلیں گا رہا تھا۔ پلاؤ زردے کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ فضائے آسمانی پر سیاہ اور سرخ کنکوے تنے ہوئے تھے ایک جانب ایک سیاہ اور ایک سرخ کنکوے میں پیچ ہو رہے تھے ہم تینوں یہ سماں دیکھتے ہوئے نواب بنن کے کیمپ میں پہنچے جہاں کل چھ آدمی موجود تھے۔ نواب بنن ایک جانب پریشان پریشان کھڑے تھے۔ میں نے بغور بنن کو دیکھا۔ واقعی صورت سے وہ چھٹے ہوئے غلام معلوم ہوتے تھے۔ انتہائی کمزور اور مرزقی۔ ان کے دونوں گالوں میں پان کی گلوریاں بری طرح ٹھسی ہوئی تھیں کر صورت اور مکروہ معلوم ہو رہی تھی بھلن کو دیکھتے ہی بنن صاحب بڑھے اور بھلن صاحب سے لپٹ کر رونے لگے بھلن صاحب نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ بھائی حکیم بدھن آگئے۔ یہ تمہاری طرف سے لڑائیں گے۔"

اتنے میں حکیم بدھن ایک آدمی کے ہاتھ سے تنا ہوا کنکوا ہاتھ میں لے چکے تھے۔ بنن صاحب کی طرف سے سرخ لڑ رہے تھے۔ ایک سرخ کٹا ہی تھا کہ حکیم بدھن نے اپنا سرخا فریق مخالف کے کالے کی طرف بڑھایا۔ دونوں کی ڈوریں ملیں اور ملتے ہی کالا کنکوا اچک کر کٹ گیا۔ اس کے کٹنے کی دیر تھی کہ دوسرا

کالا تیزی سے حکیم بڈھن کے سرنے کی طرف بڑھا۔ دونوں ملے۔ حکیم نے معمولی سی ڈھیل دی اور یہ کالا بھی کٹ گیا۔ اب کے ببن صاحب کی طرف سے وہ را کی آوازیں بلند ہوئیں۔ نواب جانی کے کیمپ کا شور ایک دم بند ہو گیا۔

تابڑ توڑ کالے بڑھنے لگے اور حکیم کے ہاتھوں کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ حکیم نے نو کالے کاٹ دیئے۔ نوشیرواں نوشیرواں کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کا جواب نہیں تھا۔ ببن صاحب اور ان کے ساتھی مارے خوشی کے ناچنے لگے ببن نے بڑھ کر حکیم بڈھن کے ہاتھ چوم لیئے اور اپنے ہاتھ سے خود چائے کی پیالی حکیم کو دیتے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب میں نے ایسا سجا ہاتھ آج تک نہیں دیکھا۔ آپ نے یہ نوشیرواں اتار کر مجھے تقریباً اس وقت تک کے نقصان سے بچالیا۔ سو سے کم کنکوے خلیق ثانی نے غالباً نہیں کاٹے ہیں۔ ان کے دو دو پیسے کنکوے کے حساب سے دو سو کی رقم بنتی تھی جو ایک نوشیرواں نے پوری کر دی۔"

ببن صاحب نے بھی بڑھ کر حکیم بڈھن کو گلے لگا لیا۔ اس گفتگو میں نواب ببن کے دو سرخے کٹ چکے تھے۔ اب کی کنکوا نواب جانی کی جانب سے لکھنؤ کے سب سے بہترین کنکیے بانہ حسنو کے ہاتھ میں تھا۔ ادھر سے شور اٹھا۔

"اجی کیا ڈر گئے۔ ذرا اس تیس مار خاں کو لیجو"

حکیم بڈھن اس آوازے پر جھلا گئے۔ فوراً ایک آدمی کے سرے لے لیا اور حسنو کے کالے کی طرف رخ پھیرا۔ میں کنکوے بازی کے فن سے باوجود

نابلد ہونے کے مزے لینے لگا۔ سرخا تیزی سے کالے کے پیچھے دوڑا اور دوڑتا ہی چلا گیا۔ کالے نے سرخے پر چھانا شروع کر دیا۔ یکایک حکیم نے اپنے سرخے کو آڑا کر کے کھینچا۔ حسنو کا کالا قلا بازی کھاتا ہوا کٹ کر ایک جانب رواں ہو گیا۔ نواب بنن کی طرف سے وہ مارا کا شور بلند ہوا۔ حکیم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ خود نواب جانی کا کالا حکیم صاحب پر اوپر سے وارد ہو گیا۔ اس نے سیدھا قطہ مارا حکیم بدھن نے ڈھیل دیدی۔ نواب جانی کا بھی کنکوا کٹ گیا۔ ادھر سے پھر وہ مارا وہ کاٹا کا شور بلند ہو گیا۔ غالباً فریق ثانی کو غصہ آ گیا تھا۔ ایک اور کالا بڑھا اور حملہ آور ہوا۔ دوسرا کالا برابر ہی فضا میں موجود رہا کہ وہ کالا اگر کٹ جائے تو یہ فوراً مجادلے میں کود پڑے اور وہی ہوا تیسرا کالا جوں ہی کٹا چوتھے کالے نے نیچے سے حکیم کے منھ لا لیتے ہوئے سرخ پر حملہ کر دیا۔ حکیم نے مسکرا کر ایک ذرا سی ڈھیل دیدی۔ چوتھا کالا بھی فضا میں کٹ کر اڑنے لگا۔ اس چوتھے کے کٹنے کے بعد گویا ایک زلزلہ تھا جو آ گیا تابڑ توڑ کالے کنکوے بہترین کنکوے بازوں کے ہاتھوں حکیم بدھن کے پر حملے کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پھر حکیم نے نو کنکوے کاٹ دیئے۔ پھر نوشیرواں نوشیرواں کا شور بلند ہوا۔ نواب بنن اور ان کے ساتھیوں نے پھر رقص شروع کر دیا۔ اب بنن صاحب وہ تماشائی بھی آ کر شریک مسرت ہو گئے جو اب تک نواب جانی کی طرف کھڑے ہو کر اس دنگل کا لطف لے رہے تھے۔ نواب بنن نے زبردستی حکیم بدھن کو خیمے میں بٹھا لیا اور کہا۔

"حکیم صاحب واللہ جی چاہتا ہے آپ کے اوپر سے صدقے ہو جائیے۔

اللہ نے کیا ہاتھ دیا ہے آپ کو۔ کیا ڈبکیاں عطا کی ہیں۔ سبحان اللہ اب ذرا دیر آرام کیجئے۔ اور دوں کو لڑنے دیجئے۔ پھر میدان میں چلے جائیے گا۔ جلدی کیا ہے؟"

بھبن صاحب کی تلاش کی گئی وہ لاپتا تھے۔ اتنے میں وہ دور سے آتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ اشتیاق کا طائفہ تھا۔ اور مٹھائیوں کے ٹوکرے چلئے اس کیمپ میں بھی ناچ گانا اور چھوتیاں شروع ہو گئیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے قہقہوں کے بعد جب حکیم بدھن خیمے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ پانچ اِدھر کے اور دو اُدھر کے اب تک کٹ گئے ہیں۔ حکیم بدھن نے پھر کنکوا ہاتھ میں لے لیا۔ ادھر سے شور بلند ہوا کسی رستم کو بھیجو۔ چنانچہ اُدھر حشمت نواب کا کالا بڑھا۔ حشمت نواب ڈھیل دے کر پیچ لڑانے کے استاد ملنے جلتے تھے۔ حشمت کا کالا جوں ہی حکیم بدھن کے سرخے سے ملا۔ نواب حشمت نے ڈور پلا کر ڈھیل دینے دی۔ حکیم بدھن نے فوراً کالے کے کنوں پر حملہ کیا اور کنے کاٹتے ہوئے فضا میں بلند ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ ماشاءاللہ کا شور پھر بلند ہوا اب کے بھی حکیم بدھن نوشیرواں اتار کر ہی مانے۔ چرخی کے غلام اور بھبن صاحب حکیم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کیمپ میں لے گئے جہاں تیل اور ماش سے ان کا صدقہ اتارا گیا۔ حکیم بدھن کا عالم یہ تھا کہ وہ ہر شخص کی تعریف پر جھک جھک کر تسلیمیں بجالا رہے تھے۔ اب شام کے چھ بج رہے تھے چائے کا دور شروع ہوا۔ سات بجے یہ پیچ ختم ہو جاتا تھا۔ نواب بنن عرف چرخی کے غلام کا سینہ غصہ سے پھولا ہوا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر حکیم بدھن نکلے۔ اب کی نواب بنن کی

طرف سے فریقِ مخالف کے آٹھ کنکوے بڑھ چکے تھے۔ ان کی طرف سے کل ایک کٹا تھا۔ حکیم بڈھن نے کنکوے کی ڈور ہاتھ میں لے لی۔ اور اب کی ایک کالا کٹنے کے فوراً بعد ہی دوسرے کالے پر خود بڑھ کر حملہ کیا اور اس کو کاٹتے ہوئے تیسرے پر حملہ آور ہوئے اور اس کو بھی کاٹتے ہوئے چوتھے پر۔ ان کی ہر کاٹ پر مجمع کا شورِ تحسین کان کھانے لگا۔ اس پرجوش حملے کی وجہ سے جانبین میں بھی ایک عجیب جوش پھیلا ہوا تھا۔ دونوں طرف کے تماشائی آسمان ہی تک رہے تھے کہ حکیم بڈھن نے اسی جوش میں نو کنکوے پھر کاٹ کر دم لیا۔ اور اب کی بجائے نواب بنن نے حملہ آور کالے کے سامنے اپنا سرخا ڈال دیا۔ بھلن صاحب نے حکیم نے ہاتھ سے نوشیرے کر اتارنا شروع کر دیا۔ اُدھر نواب جانی اِدھر نواب بنن دونوں کے کنکوے ایک دوسرے پر حملہ آور تھے کہ ریفری کی سیٹی بج گئی۔ میچ کا وقت ختم ہو گیا۔ اُدھر کالا ادھر سرخا ایک دوسرے سے الگ ہو کر اترنے لگے۔

بنن صاحب جوں ہی خیمے میں آکر بیٹھے تو لوگوں نے پھولوں کے ہار انکے گلے میں ڈالنا شروع کئے اور خود نواب بنن صاحب نے حکیم بڈھن کے گلے میں اپنی طرف سے پھولوں کے ہار لاتنے ڈالے کہ حکیم بڈھن گھبر گئے۔ اشتیاق کے طائفے نے "ہمیشہ دلبر سجان مبارک باشد" شروع کر دیا۔ نواب جانی کی طرف سے شمار کنندہ صاحب تشریف لے آئے۔ یہاں نواب بنن صاحب تھے اور ادھر مرزا قاسم شمار کر رہے تھے۔ دونوں کے اعداد صحیح نکلے حکیم بڈھن نے چار نوشیرے دال اتارے تھے جن کے آٹھ سو روپے ہوتے تھے۔ نواب جانی کے

جتنے سرخے کاٹے تھے ان کے دو روپے فی کنکوا کے حساب سے دو سو ساٹھ روپے بنتے تھے۔ چنانچہ پانچسو چالیس روپے کی رقم نواب پتن صاحب نے نواب بنن صاحب کو ایک تھیلی میں پیش کی۔ نواب بنن نے اس کو قبول کرتے ہی وہ تھیلی دونوں ہاتھوں پر رکھ کر حکیم بڈھن کو پیش کر دی۔ حکیم بڈھن نے کہا۔

"ارے بھائی نواب اس کی کیا ضرورت ہے۔ واللہ میں قبول نہیں کروں گا۔ میں تو یونہی چلا آیا تھا۔"

نواب بنن نے کہا۔ "حکیم صاحب قبلہ اگر آپ نے یہ رقم قبول نہ کی تو میں سب کے سامنے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ گھر جاتے ہی زہر کھاؤں گا زہر۔ آپ کے احسان کا یہ کوئی معاوضہ نہیں ہے بلکہ ناچیز نذر ہے۔"

حکیم بڈھن نے یہ سن کر وہ تھیلی لے کر میرے حوالے کر دی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جب میں اور حکیم بڈھن بابا صاحب کے چائے خانے پہنچے تو دن بھر کی اس اس غیر شاعرانہ مصروفیت سے بے حد تھک گیا تھا۔ چائے خانے پہنچتے ہی ہم دونوں میز پر جا کر گر گئے۔ حکیم بڈھن نے بیٹھتے ہی بلند آواز سے کہا۔

"جناب بابا صاحب! دو پیالی عمدہ قسم کی چائے جس میں ایک ایک بالائی ہو بھیجئے اور ہاں اپنے حساب کا کاغذ بھی لے آیئے میں بے باق کر دوں۔"

چائے کی دو پیالیاں اٹھائے ہوٹل کا آدمی آیا اور اس کے ساتھ بابا صاحب

سکہ لاتے ہوئے آکر پاس بیٹھ گئے اور بولے۔

"کیا حکیم صاحب کچھ ناراضگی ہو گئی ہے۔ ارے بھائی اس وقت مجھے کچھ لوگوں کا حساب دینا تھا ورنہ میری مجال ہے کہ میں تقاضا کرتا"

حکیم صاحب نے کہا "نہیں ببّا صاحب آپ کا حساب تو صاف کرنا ہی تھا۔ یہ لیجیے کھنکتے ہوئے چاندی کے سکے اپنا اس وقت کا حساب صاف کر لیجیے۔ اور یاد یہ یاد رکھیے کہ فیکٹری بند نہیں ہو گی۔ کل سے بہزاد بھی آ رہے ہیں اور میں بھی!"

ببّا صاحب کے چلے جانے کے بعد مجھ سے بولے۔

بھیا بہزاد۔ یہ فیکٹری کیسے بند ہو سکتی ہے۔ میرا خیال خام تھا۔ کل سے تم کو پھر ڈیوٹی پر آنا ہے۔ دیکھو خبردار دیر نہ ہو۔ اور ہاں یہ پچاس روپے میری طرف سے بچوں کے لئے جاؤ۔ ان کا تعلق تمہارے روزینہ سے نہیں ہے۔۔۔"

